میرزا ادیب

آنسو اور ستارے

مکتبۂ کارواں

لاہور

اشاعت دوم : اگست ۵۵ء

ناشر: چودھری عبدالحمید، ایم اے

مطبع: اردو پریس میکلوڈ روڈ۔ لاہور

قیمت: تین روپے

عزیز اور محترم دوست

احمد ندیم قاسمی

کے نام!

ترتیب

سرِ آغاز
سویرے سے پہلے ۲۸ good
آنسو اور ستارے ۵۲ good
تنہائی ۷۲
مادرِ قوم ۹۸
تمدگار ۱۱۲
روماں ۱۵۸
سیکرٹری ۱۸۲
اور یوں بھی ہوتا ہے ۲۱۲
کسی کی یاد ۲۳۸
مثبت × منفی = صفر ۲۶۶
اجنبی ۲۸۸
خوابِ گریز پا ۳۰۰

عظیم مُرتضیٰ

سرِ آغاز

جس طرح زبانیں پہلے معرضِ وجود میں آتی ہیں اور ان کے قواعد و ضوابط بعد میں
ضع کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ میں تنقیدی اصول فنی شاہکارو
تخلیق کے بعد متعین ہوتے ہیں۔ فنکار کے تخلیقی کارناموں کے محاسن اُن خطوط کو واضح کرتے
یں جن کی روشنی میں ہم بعد میں آنے والی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہیں۔ تنقید کی بُنیادیں
لیق سے استوار ہوتی ہیں، یہ علحدہ بات ہے کہ ارتقائی منازل طے کر لینے کے بعد
قیدی شعور نہ صرف تخلیقی کارناموں کے محاسن و معائب کا جائزہ ہی لیتا ہے بلکہ فنکار
ئے افق دریافت کرنے میں مدد بھی دیتا ہے۔ حُسن کی تلاش اور تخلیق میں اس کی
عاونت اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں اُس کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ تنقیدی اُصول
ر ایک طرف تخلیقی شاہکاروں پر اثر انداز ہوتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ ان سے متاثر
ی ہوتے رہتے ہیں۔ تنقید کسی ساکن نقطۂ نظر یا جامد قواعد و ضوابط تک محدود نہیں۔

کتی، اس کے سانچے مسلسل بدلتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی فنکار انہیں توڑ بھی دیتے ہیں یکن مروجہ تنقیدی زاویوں کو بدلنے یا نئے اصول وضع کرنے کا حق صرف غیر معمولی فنکاروں و ہی پہنچتا ہے جن کی بغاوت کا جواز محض نظریاتی اختلاف نہیں بلکہ خود اُن کے تخلیقی ارنامے ہوتے ہیں۔ اُن کی تخلیقات میں اُن محاسن کا وجود ہوتا ہے جن کی عدم موجودگی و تنقید نے پہلے محسوس نہ کیا ہو جنہیں تنقید صرف پہچان سکتی ہے، پیدا نہیں کر سکتی۔ عملی تنقید یں تکنیک کی کامیابی چند مخصوص یا مروجہ اصولوں کی پابندی تک ہی محدود نہیں رہتی لکہ اس کا انحصار بہت حد تک اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ فن کار اپنے مقصد کو اُجاگر کرنے یں کہاں تک کامیاب رہا ہے۔ تنقیدی ضابطوں کی یہ نرمی اور لچک ڈرامے کے سلسلے یں اور بھی زیادہ اہم ہے۔ اس لئے کہ ڈرامے کے محاسن و معائب کا صحیح اندازہ محض کنیکی پیمانوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ ڈراما اصولی طور پر پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ کھیلنے ے لئے لکھا جاتا ہے اور اس لحاظ سے اس کا صحیح جائزہ قاری نہیں بلکہ تماشائی ے سکتے ہیں، اس کو پرکھنے کی اصل کسوٹی محض فنی اصول نہیں بلکہ سٹیج ہے۔ ایک ڈراما اگر سٹیج پر کامیاب ہے تو اس میں مروجہ تکنیکی اصولوں کے لحاظ سے خواہ تنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں، کامیاب ڈراما ہے اور اس کے برعکس اگر کسی ڈرامے ے دوران میں تماشائی بالکل بے حس اور غیر جانبدارانہ انداز سے بیٹھے رہیں تو ڈراما ایک ناکام تخلیق ہے۔ خواہ وہ فنی ضابطوں کے لحاظ سے کیسا ہی مکمل کیوں نہ ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈراموں کی ایک قسم (Closet drama) ایسی بھی ہے جو کھیلے جانے کے لئے نہیں بلکہ صرف پڑھے جانے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ جن میں ڈراما نگار سٹیج کی بندش تو پابندیوں سے بے نیاز رہ کر اُن تمام وسائل سے فائدہ اٹھا سکتا ہے جو ایک ناول

ریس کو میسّر ہوتے ہیں۔ ایسے ڈراموں میں کردار کی کش مکش، ڈرامائی مواقع کی گرفت، شدّتِ جذبات کا اظہار، ڈرامے کا عروج، مرکزی خیال کی اہمیت اور عظمت — یہ سب خصوصیات مکالمے سے زیادہ اشارات کی منّت کش رہتی ہیں جن کی مسلسل دخل اندازی ڈرامے کے فطری بہاؤ کو روکتی ہے جس کے باعث قاری کے لئے بسا اوقات یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ ڈراما نگار کے درمیانی رشتے سے بے نیاز ہو کر براہِ راست کرداروں کا قرب حاصل کر سکے یوں بھی ڈراما پڑھتے وقت زندگی کی ہماہمی کا وہ احساس کم ہوتا ہے جو اسے سٹیج پر دیکھنے سے ہو سکتا ہے۔ پڑھے جانے کے لئے ناول زیادہ موزوں فارم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر ڈراما پڑھا بھی جا سکتا ہے لیکن جیسا کہ ایک نقّاد Howe نے لکھا ہے:۔

> **Drama is one-half a matter of visual demonstration : a blind man sitting in a theatre could take away only one-half of a true play's content; and to read the bare printed pages of a play is to be in the position of the blind man.**

اُردو ادب دوسری اصناف میں قابلِ قدر ترقی کے باوجود ڈرامے کے معاملے میں ابھی تک تہی مایہ ہے۔ اس کے بہت سے وجوہ ہیں۔ تاریخی اعتبار سے اردو ڈرامے کا آغاز ایسے راگ ناٹکوں سے ہوا جو رقص و نغمہ کی ڈرامائی ترتیب سے عبارت تھے اور جن کی پیش کش کا انداز مذہب کے قدیم نمونوں سے متاثر تھا۔ تکنیکی لحاظ سے یہ ڈرامے ادبی پایے

یادہ قریب ہیں۔ ان ڈراموں کی خالص تفریحی نوعیت اور اس سے زیادہ ان کی پیش کش ے عامیانہ انداز کی وجہ سے ڈراما کا فن ایک ایسے طبقے سے مخصوص ہو کر رہ گیا، جسے سندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس تخصیص کا اثر یہ ہوا کہ ڈرامے کو بطور ایک فن کے ماری معاشرتی زندگی میں کوئی مناسب اور باعزت مقام نہ مل سکا جس کے باعث پڑھے لکھے لوگوں نے یقینی طور سے شعوری اور غیر شعوری طور پر اجتناب کیا۔

ڈرامائی ادب کو سیاسی اور معاشرتی پس منظر میں دیکھنے سے یہ بات غیر واضح نہیں ہتی کہ ڈرامے کے ارتقا کے لئے قومی کردار میں مستعدی اور جفاکشی کے عناصر کا ہونا گزیر ہے۔ ایسا معاشرہ جو سیاسی اور ذہنی لحاظ سے جمود و تعطل کا شکار ہو ڈرامائی ادب ں تخلیق و ترویج کے لئے سازگار نہیں ہوتا، ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد ہمارے ادب میں ڈرامے ں طرف جو واضح میلان نظر آتا ہے، اس کے پس منظر میں وہی سیاسی کشمکش، سماجی شعور ور ذہنی بیداری کار فرما تھی جس نے اس دور کے قومی کردار اور معاشرتی زندگی کے سب پہلوؤں کو متاثر کیا۔ ہماری معاشرتی زندگی میں طبقاتی ذہنیت اور جاگیردارانہ نظام قدار کی وجہ سے جو ٹھہراؤ، پس ماندگی اور زندگی کی ہماہمی کے احساس کا فقدان ہے وہ دب اور بالخصوص ڈرامائی ادب کی تخلیق کے لئے ناسازگار رہے۔

نفسیاتی اعتبار سے اصنام پرست معاشرہ جس میں انسانی جبلتوں کو دیوتاؤں کے خارجی پیکر نصیب ہوں، ڈرامائی ادب کے لئے زیادہ سازگار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جبلتوں کے باہمی یا سماجی اقدار سے تصادم کی ڈرامائی نوعیت کو خارجی صورت میسر آ سکتی ہے۔ قدیم یونانی اور سنسکرت ڈرامے کے ارتقا اور عروج کی غالباً سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ ان کے پس منظر میں ایک بھرپور علم الاصنام کار فرما تھا جسے ڈرامائی جذبات

ے اندرونی مناسبت تھی، ابتدا میں چونکہ ڈرامے کے تمثیلی پہلو کی نوعیت زیادہ تر مذہبی
تی۔ اس لئے توحید پرست معاشرے میں ڈرامائی ادب کے امکانات ہمیشہ کم رہے ہیں شاید
س نے تسلیم و رضا کی کُھر حادثات کے ڈرامائی امکانات کو دھندلا دیتی ہے یا ایسی
خصیات کو سٹیج پر پیش کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ جن کی زندگی سے متعلق اعلےٰ درجے کے ڈرامے
خلیق ہو سکتے ہیں۔ اردو ڈرامے میں اولیں کوششوں میں بھی جنہیں باقاعدہ ڈرامے کا درجہ نہیں
یا جاتا، ہندی دیومالا کا اثر موجود ہے، خود امانت کی 'اندرسبھا' ہندی دیومالا اور اسلامی
روایات کا امتزاج ہے۔ 'اندرسبھا' کا پس منظر دیومالائی ہے اور تکنیک کے اعتبار سے
منظوم ناٹک مثنوی سے بہت قریب ہے۔ اس لئے کہ اسلامی شاعری میں مثنوی ہی ایک
یسی صنف تھی جس میں کہانی اور کردار کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اُردو کے ابتدائی ڈراموں
ں مثنوی کا اثر بہت واضح ہے۔ بہرصورت ڈرامانگار کو اگر یہ نفسیاتی سہولت میسر ہو
ہ وہ اپنے داخلی احساس اور خارجی شعور کی کش مکش یا جبلتوں کے باہمی یا سماجی اقدار سے
صادم کو خارجی شکل دینے کے لئے دیومالائی پس منظر کا سہارا لے سکے تو پھر یہ ضروری
ے کہ اسے اپنے معاشرے کے نظام اقدار، اپنی شخصیت اور تجربے سے پوری آگاہی
ل ہو جس کے بغیر ڈرامائی احساس کا فنکارانہ اظہار یا ڈرامے کی تخلیق ناممکن ہے ——
رہمارے ڈرامانگاروں کو ابھی یہ آگاہی نصیب نہیں ہو سکی۔

ناسازگار ماحول اور حالات کی نامساعدت کے علاوہ اُردو ڈرامے کی سست
تاری کی ایک سیدھی سادی وجہ تھیٹر کا نہ ہونا بھی ہے۔ یہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے
ہمارے ہاں ایسے ڈرامے ہی تخلیق نہیں ہوتے جو تھیٹر کو رواج دینے میں مدد دیں لیکن
ت پھر وہی آجاتی ہے کہ ایسے ڈراموں کی تخلیق کے لئے تھیٹر کے محرک کا ہونا لازمی

ہے۔ بحیثیت ڈرامہ نگار ہونے کا دوسرا اثر یہ ہے کہ اردو میں ادھر کچھ عرصہ سے جو تھوڑے بہت ڈرامے لکھے گئے ہیں وہ ٹکنیک کے اعتبار سے (acted play) کی بجائے (closet drama سے زیادہ قریب ہیں یعنی جو سٹیج پر پیش کئے جانے کی بجائے پڑھنے کے ئے زیادہ موزوں ہیں۔ بہت کم ڈرامے ایسے ہیں جو دونوں لحاظ سے موزوں ہوں۔ "آنسو ور ستارے" ایسے ہی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔

میرزا ادیب کے یہاں Closet drama کے تفصیلی اشارات کی ٹکنیک کا ستعمال مکالمے کی جگہ نہیں بلکہ مکالمے کی خصوصیت کو اجاگر کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ ٹکنیکی سہولت کے لئے نہیں بلکہ اُس مخصوص فضا یا ماحول کے پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے جس یں کرداروں کے خدوخال، اُن کی نفسیاتی کیفیت اور اُن کا اندازِ عمل واضح تر ہو سکے۔ ٹیج ڈراما کی ٹکنیک کے نقطۂ نظر سے یہ اشارے ڈرامے کا لازمی جزو نہیں بن پاتے۔ اس ئے کہ ان سے صرف قاری مستفید ہو سکتا ہے۔ انہیں براہِ راست سٹیج پر منتقل کرنا قریب قریب اممکن ہوتا ہے۔ ایسے تفصیلی اشاروں کا پس منظر اگر ڈرامے کا بنیادی جزو ہو تو اُس کی وضاحت نظر یا سٹیج ہدایات سے نہیں بلکہ مکالمے سے کی جاتی ہے۔ زیرِ نظر ڈراموں میں ایسے شارات کا استعمال ڈرامے کی رُوح سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ہے ورنہ سٹیج ڈراما کی حیثیت سے متعلقہ ڈرامے ان تفصیلی اشارات کے بغیر بھی مکمل ہیں۔

میرزا ادیب کے ڈراموں کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی سادگی اور اُن کا فطری پن ہے۔ قریب قریب سب ڈرامے ایسے کرداروں سے متعلق ہیں جنہیں ہم روز دیکھتے ہیں ایسے واقعات اور حالات کی عکاسی کرتے ہیں جن سے ہم کسی وقت بھی دوچار ہو سکتے ہیں اور اسی لئے ان ڈراموں کے بنیادی عناصر کی ترتیب زیادہ لطیف، ان کا جذباتی

بناؤ زیادہ فطری اور ان کے کرداروں کی ڈرامائی مواقع سے ہم آہنگی زیادہ نازک ہے ان ڈراموں کی بنیادیں غیر معمولی کرداروں اور خلاف معمول واقعات پر قائم نہیں کی گئیں۔ یہ ہماری روزمرہ زندگی کی تصویریں ہیں اور ان میں وہی سادگی و پُرکاری ہے جو حقیقت نگاری کا لازمی جُزو ہے۔ ڈرامے کی تعمیر اگر غیر انسانی کردار یا غیر فطری واقعات پر کی گئی ہو تو وہ پنی تمام تر کامیابی کے باوجود ایک معیاری تخلیق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اس میں وہ انسانی قدریں یا قدروں کی انسانیت پیدا نہیں ہو پاتی جو ادبِ عالیہ کی جان ہے۔ زندگی صرف ڈرامے کا مواد ہی مُہیّا نہیں کرتی بلکہ اس کا آدرش بھی ہے اور اسی لئے یہ ضروری ہے ک ڈرامے کے موضوع اور کرداروں کا انتخاب کرتے وقت انسانی قدروں کی نزاکت ور اہمیت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ مرکزی خیال کا تسلسل اور واقعات کی ترتیب تنی فطری اور ڈرامے کا مجموعی اثر حقیقت سے اتنا قریب ہونا چاہیئے جس کے متعلق تماشائی رک ٹوین کے یہ الفاظ دہرا سکے کہ "ممکن ہے ایسا ہوا ہو، ممکن ہے نہ ہوا ہو، بہر حال ایسا ہو کتا ہے"۔ ارسطو نے بھی مؤرخ اور شاعر (ڈراما نگار) میں فرق بیان کرتے ہوئے یہی ت کہی ہے کہ اوّل الذکر اُن واقعات کو قلم بند کرتا ہے جو گذر چکے ہوں اور ثانی الذکر یسے واقعات کے متعلق لکھتا ہے جو گذر سکتے ہیں۔

"سحر سے پہلے" ایک ایسے ہی عام واقعہ کی تمثیل ہے۔ ایک طوائف کے گھر کسی شخص ا چوری کی غرض سے جانا بہت معمولی واقعہ ہے لیکن میرزا ادیب نے اس پس منظر میں کالج ے ایک گھناؤنے پہلو کو بے نقاب کیا ہے۔ "سحر سے پہلے" ایک موضوعی ڈراما ہے۔ ایسے راموں میں بنیادی خیال کردار اور مواقع سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اصل مقصد کردار نگاری ڈرامائی مواقع پیدا کرنا نہیں ہوتا بلکہ موضوع کی اہمیت کو واضح کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے کردار

مواقع کے اُبھرنے کا امکان صرف اسی حد تک ہوتا ہے جہاں تک وہ موضوع کی وضاحت ملیں۔ از خود اُن کی اہمیت کم ہوتی ہے۔ "سحر سے پہلے" کا مرکزی خیال یہ مسئلہ ہے کہ نسان چور کیوں بن جاتا ہے۔ انسان گناہ کے کنوئیں میں کیوں چھلانگ لگا دیتا ہے: اور طوائف اس ڈرامے کے ہی نہیں ہماری سماجی زندگی کے بھی دو اہم کردار ہیں حر سے پہلے" انہیں بہت قریب سے بلکہ اُن کے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھنے ایک کوشش ہے۔ چوری اور عصمت فروشی کے پسِ پردہ دم توڑتی ہوئی انسانیت دیکھنے کی کوشش ہے۔ اُن انسانوں کو سمجھنے کی سعی ہے جو سوسائٹی کے دشمن نہیں بلکہ ں کے زخم خوردہ ہیں۔ جو مہذب سوسائٹی کے معزز ارکان کی باطنی آلودگی کے خارجی مظہر ں اور" دوسروں کی کثافت اور خیالات کی گندگی کو چپ چاپ اپنے سینے سے لگائے تے ہیں"۔ جن میں انسانی ہمدردی کا جذبہ "یتیموں کو جنت کی خوشخبری دینے والے مولوی ..... شہر کے سب سے زیادہ خیرات دینے والے رئیس، اور قومی جماعتوں کے سیکرٹریوں" ے کہیں زیادہ ہے۔ چور صرف وہی نہیں جو پیٹ کی آگ کے شعلے بجھانے کے لئے وری کرتے ہیں۔ اُن سے کہیں زیادہ قابلِ تعزیر وہ چور ہیں جو طوائف کے الفاظ میں اپنوں اور بیگانوں سے چھپ کر ..... میرا سامان نہیں، میرے گوشت پوست سے چرانے آتے تھے وہ جو کچھ مانگتے تھے، جو کچھ چرانا چاہتے تھے بڑی خوشی سے لے جاتے تھے۔ راتوں کی نیند، دل و دماغ کا سکون اور ان کے علاوہ رُوح کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی وہ چیز جو ایک عورت کو دُنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے"۔ "سحر سے پہلے" جرائم اور عصمت فروشی کے اقتصادی پس منظر کا مطالعہ ہے اور اُن لوگوں پر ایک طنز ہے جو "مجرم کے جُرم کو دیکھتے ہیں، مجرم کے پیٹ کو نہیں":

"آنسو اور ستارے" کا موضوع بھی ہماری قومی زندگی کے ایک ہنگامی مگر اہم اور
ازک مسئلے سے متعلق ہے۔ بازیافتہ عورتوں کا مسئلہ اور خصوصاً اُن کا جو اپنے ساتھ اپنی "بیکسی
ں نشانی" بھی لے آئی ہوں، ہمارے معاشرے کی ایک دُکھتی ہوئی رگ ہے۔ "آنسو اور ستارے"
س مسئلے کے عملی حل کی طرف ایک اشارہ ہے، جیسا کہ موضوع سے ظاہر ہے یہ ڈراما تقسیم
ے بعد کی ہنگامی صورتِ حالات اور وقتی تقاضوں کے پیشِ نظر لکھا گیا ہے اور اس کے
وجود کہ اس کی محرک ایک نمایاں قسم کی مقصدیت ہے جس سے بعض اوقات تکنیکی کمزوریوں
ا جواز پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ ڈراما تکنیکی لحاظ سے کامیاب بلکہ جہاں تک **Suspense** کا
علق ہے یہ مجموعے کے کامیاب ترین ڈراموں میں سے ہے۔ تکنیکی باریکیوں سے قطع نظر
Suspens کی تین بنیادی صورتیں ہوتی ہیں پہلی وہ جہاں قاری یا تماشائی ڈرامے کے
نجام کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتا ہو، لیکن جاننے کے لئے مضطرب ہو، دوسری وہ جہاں
سے کچھ اندازہ سا ہو اور وہ اس کی تصدیق کرنا چاہے اور تیسری وہ جہاں انجام قریب
ریب ظاہر ہو مگر وہ حالات کا رُخ نہ موڑ سکنے کی بے بسی کا احساس لئے دم بخود اس کا منتظر
ہے۔ "آنسو اور ستارے" میں **Suspense** کی پہلی قسم سے کام لیا گیا ہے یہ ڈراما [illegible] شخصیت
ور متضاد قدروں کی کشمکش کا ایک کامیاب مطالعہ ہے اور اس کشمکش کے متضاد پہلوؤں
ے پس منظر کو اتنی ہم آہنگی، نرمی اور ہمدردی سے واضح کیا گیا ہے کہ قاری یا تماشائی کرداروں
ں ذہنی کیفیت کو نہ صرف سمجھ سکتا ہے بلکہ اُن کی شدت کو محسوس بھی کرتا ہے۔ کرداروں
ا یہ قرب اور اُن کی قابلِ رحم صورتِ حال اُن سے ایک ہمدردانہ تعلق اور دلچسپی پیدا
رتی ہے اور ان کے مستقبل کو نہ صرف جاننے بلکہ اسے ایک خوشگوار صورت میں دیکھنے کی
رزو بھی پیدا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ ڈرامے کا انجام اگرچہ کسی حد تک غیر متوقع سا ہے لیکن

ت توقع محسوس نہیں ہوتا۔ پی وائلڈ کے الفاظ میں تذبذب اور ہمدردانہ دل چسپی —
Suspen کی بنیادی خصوصیت ہے اور یہ خوبی اس ڈرامے میں بدرجۂ اتم موجود ہے
یہی خوبی "شہنائی" کی جان ہے۔ "شہنائی" میں Suspense کی دوسری صورت کا تجربہ
ہے۔ ناہید کے سنہرے خواب کی نوعیت سے ڈرامے کے آغاز ہی میں انجام کی ایک جھلک
موجود ہے لیکن پھر بھی اس خیال کی تصدیق ضروری سی معلوم ہوتی ہے۔ ویسے بنیادی طور
شہنائی" کی عظمت اور اس کا حسن suspense سے زیادہ اس کی فضا atmos
pher میں ہے۔ کانٹ نے لکھا ہے کہ "خواب ایک مختصر دیوانگی ہے اور دیوانگی ایک
ل خواب"۔ اگرچہ ناہید کی محبت کو دیوانگی یا مریضانہ تخیل کہنا اس کی توہین کرنے کے مترادف
لیکن یہ محبت ایک ایسا ہی طویل خواب ہے۔ جس کی شکست ناہید کے دل کی رگوں کا ٹوٹنا
ے۔ اس کے رشتۂ جاں کا انقطاع ہے۔ سجاد ایک خیالی پیکر ہونے کے باوجود ایک
قت ہے۔ اس لئے کہ وہ ناہید کی شخصیت کا ایک پہلو ہے۔ اس کی زندگی کا جزو ہی
ں بلکہ خود زندگی ہے جسے برقرار رکھنے کے لئے اس کا وجود ناگزیر ہے۔ یہ تعلق ایک خواب
ں لیکن ایسا خواب جہاں بیداری اور موت میں فرق نہیں۔ ہمارا "شہنائی" ایک رومانی کہر اور
ب آلود فضا میں ڈوبا ہوا ڈراما ہے اور اس فضا کی تخلیق میں نہایت لطیف اشاریت سے
م لیا گیا ہے۔ "شہنائی" کی آواز ناہید کے دل کی دھڑکنوں کی آواز ہے اور سٹیج ہدایات میں
ں مناسبت کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شہنائی کی آواز ناہید
جذباتی ہیجان کی شدت کے مطابق بلند یا مدھم ہوتی ہے۔ سعیدہ کے قرب سے شہنائی کی
از کا بلند نہ ہونا دراصل خارجی ماحول کے احساس کی وجہ سے ناہید کے جذباتی ہیجان کا
و ہے۔ ڈرامے کی فضا اور ناہید کے کردار کے نفسیاتی پس منظر میں ایک یگانگت ایک ہم آہنگی

ں سے شدید جذباتی تاثر پیدا کرنے میں بہت مدد لی گئی ہے۔ "تنہائی" کے کرداروں کے منظر میں بڑی لطیف نفسیاتی اشاریت ہے۔ جاوید، ناہید کی شخصیت سے علیحدہ کوئی د نہیں رکھتا۔ یہ اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مظہر ہے۔ اس کے پیکر میں ناہید کے وہی ب سانس لیتے ہیں جو تصورات کے دھندلکے میں زندگی کی شاہراہ پر تیرہ سال اس کے ھ ساتھ چلتے رہے اور جنہیں ایک دن دامن پکڑ کر وہ زندگی میں لے آئی تاکہ اپنے اردگرد یلے ہوئے منجمد یخ بستہ اندھیرے میں روشنی کی کرنیں پھوٹتی ہوئی محسوس کر سکے۔ سعیدہ کا دار بھی بظاہر متضاد ہونے کے باوجود ناہید کی شخصیت کا ہی ایک جزو ہے۔ سعیدہ ہید کی شعوری کیفیت کا مظہر ہے۔ جاوید کے حقیقی پیکر ہونے میں ناہید کو جو شکوک ہو سکتے ں، ان کا اظہار سعیدہ کی زبان سے کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے سعیدہ کا کردار از خود کوئی رادی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ناہید کی داخلی کش مکش کا ایک پہلو ہے

"تنہائی" کا پس منظر داخلی احساس اور شعوری کیفیت کی کش مکش ہے۔ "تنہائی" کے داروں کو اگر اس نفسیاتی پس منظر میں دیکھا جائے تو وہ سب ناہید کی شخصیت کے مختلف وپ ہیں۔ اس لحاظ سے "تنہائی" مختلف کرداروں کے باوجود ایک طویل تنہا کلامی ہے س میں جذبے کی مختلف صورتوں کو خارجی پیکر دیے گئے ہیں۔ شہزادے کی کہانی اور یدہ کے خواب جیسی معمولی جزئیات بھی اپنی اشاراتی اہمیت کی وجہ سے اس فضا کے پیدا نے میں مدد دیتی ہیں۔ جو اس ڈرامے کی جان ہے۔ فضا کے لحاظ سے "تنہائی" مجموعے بہترین ڈراما ہے۔

"خوابِ گریزپا" بھی منقسم شخصیت کا ایک کامیاب مطالعہ ہے۔ امّاں اور رانی کے دار بظاہر متضاد ہونے کے باوجود ایک ہی شخصیت کے دو رُخ ہیں۔ رانی کا کردار نفسیاتی

عتبار سے اماں کے کردار کا ہی ایک پہلو ہے۔ اماں کے شعوری احساس کی آواز ہے۔ اخلی طور پر اماں کو اپنے بیٹے کے متعلق وہی شکوک ہیں جن کا اظہار رانی کی زبان سے کیا گیا ہے لیکن شعوری طور پر وہ انہیں تسلیم نہیں کرنا چاہتی۔ یہاں تک کہ سب کچھ دیکھ لینے اور بیٹے ے اعتراف کے بعد بھی وہ اسے محض ایک بھیانک خواب ہی سمجھتی ہے۔ یہ بیٹے کے متعلق عوری خوش اعتقادی کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا دینے کی آخری کوشش ہے۔ ڈی ایچ رنس نے لکھا ہے:-

By strength of will, we cut off our inner intuitive knowledge from admitted consciousness. This causes a state of dread or apprehension which makes the blow ten times harder when it does fall.

”خواب گریزپا“ کا نفسیاتی پس منظر اسی نوعیت کا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے اماں کو بیٹے ادی کا صدمہ اتنا شدید اور کرب کا احساس اتنا گہرا ہے جسے جیتے جی قبول کرنا اس کے امکان ے باہر معلوم ہوتا ہے۔ اس کے فوری ردِّعمل میں حقیقتِ حال سے انکار نہیں گریز ہے بظاہر ے یقین ہے لیکن نفسیاتی طور پر یہ یقین محض ایک خوں گشتہ آرزو ہے کہ ”وہ ابھی آئے گا —— میرا بلبلم، آتے ہی کہے گا۔ اماں کھانا کہاں ہے“ اور اس گریز کا بڑا موثر اور دردناک بار اماں کے آخری فقرے میں ہے“۔ توبہ، کہنے لگا۔ میں دور چلا گیا ہوں —— افق کے ں پار“

Suspense) کی وہ صورت جہاں ڈرامے کا انجام قریب ظاہر ہو، المیے ے وہ مناسبت رکھتی ہے۔ سزا یافتہ مجرم کو پھانسی کے تختے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھنے والا

س کے انجام سے بے خبر نہیں ہوتا لیکن مجرم کے ہر قدم کے ساتھ دیکھنے والے کا سانس گھٹتا چلا جاتا ے۔ جذبات کی شدت اذیت دہ حد تک پہنچ جاتی ہے سب کچھ جانتے ہوئے بھی حیرت دگی کا یہ عالم یہ ذہنی کیفیت ہی Dramatic suspense ہے۔ اس قسم کے Suspen کی کامیاب ترین صورت وہ ہے جہاں انجام آخری مرحلے تک ممکن یا متوقع ر آئے، تاکہ یہ محسوس نہ ہو "نند کمار" میں ایسا ہی Suspense پیدا کیا گیا ہے۔ اس ص نقطۂ نظر سے یہ مجموعے کا کامیاب ترین ڈراما ہے "نند کمار" میں مواقع کی ڈرامائی یت اور ڈرامے کے مجموعی تاثر کو اجاگر کرنے کے لئے اس کے تاریخی پس منظر کو نہایت ہی ے واضح کیا گیا ہے۔ ڈرامے کے ابتدائی منظر میں کونسل کے ارکان کی بحث خصوصاً فرانسس شدید اختلاف اور ہیسٹنگز کا مشکوک طرز عمل ایک کامیاب expository device ہے ے میں صرف "نند کمار" ہی ایک ایسا ڈراما ہے جس میں off-stage action کی ت سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ موت کا منظر سٹیج پہ پیش کرنا شاید وہ بھی پیدا نہ کر سکتا جو اس سے متعلق بارول کے بیان سے پیدا کیا گیا ہے۔ نند کمار کی باوقار ت کا یہ بیان نفسیاتی اعتبار سے اور بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے کہ بارول نند کمار دوست نہیں بلکہ دشمن ہے۔ "نند کمار" برطانوی سامراجی ذہنیت اور ہندوستانی سیاسی ر کی کشمکش کا ایک کامیاب مطالعہ اور تکنیکی لحاظ سے ایک کامیاب ڈراما ہے

"تنہائی" کی طرح "اجنبی" میں بھی مجموعی تاثر کو نفسیاتی پس منظر اور ایک مخصوص فضا کر کے اجاگر کیا گیا ہے۔ عزیزہ کے ذہن کے رومانی دھندلکوں میں اجنبی کے خدوخال اس طرح دکھائی دیتے ہیں کہ ہم اس کے حقیقی وجود پر یقین نہ کرتے ہوئے بھی اس آمد کے منتظر رہتے ہیں۔ عزیزہ کے بیان کو سچ نہ مانتے ہوئے بھی اجنبی کو محض وہم نہیں

جھتے۔ اجنبی کی پُر اسرار شخصیت کے متعلق ہماری ذہنی کیفیت کچھ اس قسم کی رہتی ہے۔ جسے
رج کے الفاظ میں Suspension of disbelief کہا جاسکتا ہے۔ اجنبی کی
مد کے ساتھ ہی پُر اسرار کُہر میں ڈوبی ہوئی طلسماتی کیفیت اچانک ایک تلخ حقیقت کے
ساس میں بدل جاتی ہے۔ عزیز کے رومانی شیش محل کا پُر اسرار اجنبی وہ انسان نہیں
تا جسے "آرزو کی شدّت موت کی سرحد سے کھینچ کر زندگی کی حدود میں لے آئی ہو"۔
ہ وہ ایک چور ہے جس کے سینے میں نہیں، پیٹ میں شعلے بھڑک رہے ہیں جو ان لاکھوں
روڑوں انسانوں کا نمائندہ ہے جو عالی شان کوٹھیوں کے سائے میں کپڑے اور روٹی کو
تے رہتے ہیں اور پھر جُرم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ "اجنبی" ایک مزاحیہ طنز بھی ہے
ن لوگوں پر جو "غریبوں کو لوٹتے ہیں اور پھر اپنی کوٹھیوں میں نرم نرم گدیلوں پر بیٹھ کر
ومانی خواب کے جال بُنتے ہیں"۔ "اجنبی" میں مخالف صورتِ حال بڑی کامیابی سے پیدا
گئی ہے۔

ڈرامے کے مرکزی خیال کو مخالف مواقع سے واضح اور مؤثر بنانے کا حربہ "کسی کی یاد"،
رومان"، "سیکرٹری" "اور یوں بھی ہوتا ہے" اور "مثبت × منفی = صفر" میں بھی نہایت
امیابی سے استعمال کیا گیا ہے۔ ان تمام ڈراموں میں ایک مزاحیہ طنز ہے۔ محبت کی حسرت
ے محبت تک کا خلا جنسی زندگی کا اہم پہلو ہے۔ کہکشاں کے بکھرے ہوئے موتیوں کی جھالروں
ے نوکروں کی تنخواہ کی ادائیگی تک اور افق سے برستے ہوئے نغموں کی گونج سے ڈاکٹر کی
یس تک وہی فاصلے ہیں جو رومان زدہ طبائع کو حقیقت سے ہم آہنگ نہیں ہونے دیتے،
زدواجی زندگی کی مسرّتوں کے تصوّر اور پاگل پن کے امکان میں جو ایک بے ربط سا تسلسل
ہے۔ اُس سے ہماری سماجی زندگی نا آشنا نہیں۔ بلائے جان رشتہ داروں کی آفت

سے ہم سب واقف ہیں۔ یہ ڈرامے زندگی کے ان پہلوؤں کی طرف بڑے لطیف اشارے ہیں جنہیں یا تو مخالف مواقع پیدا کر کے واضح کیا گیا ہے یا کرداروں کے چند خصائص کو آخری حد تک طول دے کر ظاہر کیا گیا ہے۔ ان مخصوص ڈراموں کے تمام کردار مثالی ہیں (یوں بھی جیسا کہ برگساں نے کہا ہے طربیہ کا تعلق شخصیتوں سے زیادہ مخصوص طبقوں سے ہوتا ہے) محبت اور تخیل (کسی کی یاد) اُن افراد کی نمائندگی کرتے ہیں جو انسانوں سے نہیں بلکہ محبت کے تصور سے محبت کرتے ہیں اور جن کی مریضانہ جنسی زندگی ہر خارجی پیکر میں اپنے تخیلی محبوب کے نقش دیکھ پاتی ہے۔ بتول، نسیمہ اور سلیم (رومان) کو تو ہم سب پہچانتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم اُنہیں کسی اور نام سے جانتے ہوں۔ پروفیسر اور چمار (سیکرٹری) اُن افراد میں سے ہیں جو زندگی کے تمام تنوع اور وسعت کو چند منطقیانہ اصولوں میں محدود کر لینا چاہتے ہیں اور اس کوشش کے غیر فطری اور احمقانہ پہلو کو کبھی سمجھ جاتے ہیں اور کبھی نہیں بھی سمجھ پاتے۔ تنویر (اور یوں بھی ہوتا ہے) ان لوگوں میں سے ہے جنہیں پیغمبری کی تلاش آگ سے دوچار کر دیتی ہے اور چچا جی (مثبت x منفی = صفر) ان مخلص بزرگوں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کے خلوص اور شفقت کے دھارے دل سے نہیں، پیٹ سے پھوٹتے ہیں۔

"نادرِ قوم"، "سیکرٹری" اور "خوابِ گریزپا" میں بھی مرکزی تاثر کو مخالف مواقع سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ لیکن ان میں مواقع کا تضاد اُن کے تقابل سے نہیں بلکہ ایک پہلو پر مسلسل اصرار سے نمایاں کیا گیا ہے۔ کلثوم سلطان کا ابراہیم کے متعلق یہ فیصلہ کہ "اُسے وہی سزا دو جو ایک قاتل کو دینی چاہیئے۔" اس وجہ سے زیادہ اہم ہے کہ یہ اُس ماں کا فیصلہ ہے جس کے متعلق بتایا جا چکا ہے کہ "شاید ہی دُنیا میں کسی ماں کو اپنے بیٹے سے اتنی محبت ہو گی جتنی

ر اپنے لخت جگر سے ہے" اور یہ کہ تسو لائے بیٹے کے ملک کا دُنیا میں اور کوئی عزیز نہیں ہے"
ں بیٹے سے اس والہانہ محبت کے اس پس منظر کی غیر موجودگی میں شاید مجموعی تاثر اتنا کامیاب
نا۔ اگر محمود کے ساتھ پروفیسر کا سلوک اتنا منطقیانہ نہ ہوتا تو پروفیسر کے ساتھ جبّار کے
نسانی سلوک کا ردِ عمل موجودہ صورت سے بہت مختلف ہوتا۔ "خواب گریزپا" میں ماں
پیار کا مسلسل تذکرہ بھی مجموعی تاثر کو اُجاگر کرنے کے لئے کیا گیا ہے اور اس بار بار ذکر
مقصد محض تکرار repetition نہیں بلکہ مسلسل اصرار **repeated emphasis** ہے

زیرِ نظر ڈراموں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کے مزاحیہ عناصر کی لطافت اور شائستگی بھی
ور یہ خصوصیت اس لحاظ سے اور بھی اہم ہے کہ اردو ڈرامے میں مزاح کا معیار عام طور
ناقی عامیانہ رہا ہے بلکہ بعض اوقات ابتذال کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اس کی ذمہ داری
ز عوام کی ذہنی سطح پر ہی نہیں بلکہ بہت حد تک ڈراما نگاروں پر بھی ہے۔ المیہ کے
جکا تعلق زیادہ تر زندگی کے داخلی اور اخلاقی پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ طربیہ کا بنیادی
سماجی قدروں کی تشکیل اور بقا ہے اور اس لحاظ سے عوام کی تفریحی ضروریات کو پورا
ے کے ساتھ ساتھ اُن کی ذہنی سطح کو بلند کرنا بھی ڈراما نگار کے فرائض میں سے ہے۔
ڈراموں میں مزاح عام طور پر نقل، عملی مذاق، عجیب و غریب لباس یا لفظی بازیگری
محدود رہا ہے۔ اس کے برعکس زیرِ نظر ڈراموں میں اس فرسودہ روش سے ہٹ کر
ح کسی کردار یا واقعہ کے مضحک پہلوؤں سے پیدا کیا گیا ہے۔ جس کے پس منظر میں
گی کی ایک لہر سی ہے۔ "رومان" کے سنجیدہ مزاح کے برعکس "سیکرٹری" میں ایک
یہ سنجیدگی ہے۔ "اور یوں بھی ہوتا ہے" ایک دلچسپ **Comedy of errors**
ثبت "منفی = صفر" میں مزاح کی نوعیت طنزیہ ہے جو "کسی کی یاد" اور "اجنبی" میں

ہ واضح ہے۔

مجموعی اعتبار سے میرزا ادیب کے اسلوب میں توازن، اعتدال اور ایک ٹھہری اور
لی ہوئی کیفیت ہے۔ احساس کی شدّت اور جذبے کی گیرائی میں داخلی نظم و ضبط ہے
نی فطرت، سماجی اقدار اور ان کی باہمی کش مکش کا ادراک اور شعور اور معاشرے کی
اریوں کے خلاف احتجاج ہے۔ "آنسو اور ستارے" زندگی کی پُرخلوص تصویروں کا
ہ ہے اور جس طرح زندگی کی تمام متنوع کیفیات میں ایک خاص ربط اور تسلسل قائم رہتا
اسی طرح موضوع کے تنوع کے باوجود ان ڈراموں میں ایک فکری وحدت اور نظریاتی
جہتی موجود ہے۔ حیات و کائنات کے متعلق ایک مخصوص زاویۂ نظر کا اظہار، زندگی
بت اور جان دار قدروں کا احساس، انسان دوستی اور اس کے حسین مستقبل کی
و موجزن ہے اگرچہ اس مستقبل کا کوئی واضح اور غیر مبہم تصور پیش نہیں کیا گیا، لیکن اس
رب کا احساس ضرور ملتا ہے۔

یہ مبہم سی کیفیت ہمارے عبوری دور کی خصوصیت ہے۔ میتھو آرنلڈ کے الفاظ میں
ں اس وقت دو دنیاؤں کے درمیان کھڑے ہیں، "ایک مر چکی ہے اور دوسری
ھی پیدا ہونے کی سکت نہیں"۔ ان ڈراموں میں بہر حال ایسے مستقبل کی طرف امید افزا
ے ضرور موجود ہیں۔ "جب دولت، عزت اور زندگی کی مسرتیں صرف چند لوگوں
ں نہیں، سب لوگوں میں تقسیم ہوں گی، جب ہر شخص زندگی سے محبت کرے گا۔ وہ
آنے والا ہے —— وہ وقت آ رہا ہے۔"

سحر سے پہلے

کردار :

○ ایک مرد

○ ایک عورت

منظر

سٹیج کا بیشتر حصہ تاریکی میں ہے۔ صرف وہ حصہ نظر آ رہا ہے، جہاں ایک عورت پلنگ پر لیٹی اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھے، چپ چاپ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی فضا کو گھور رہی ہے۔ پلنگ کے قریب جو کھڑکی ہے، اُس کے دونوں پٹ کھلے ہیں۔ اس وقت رات کا پچھلا پہر ہے۔ چودھویں رات کا چاند اپنی پوری تابانی کے ساتھ آسمان کی نیلگوں پہنائیوں میں چمک رہا ہے اور اسی کی روشنی کھڑکی کی راہ سے داخل ہو کر عورت اور اُس کے ارد گرد پڑ رہی ہے —— وہ ایک نحیف و نزار عورت ہے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، گال پچکے ہوئے اور چہرے پر ایک ایسی ڈراؤنی اور بھیانک کیفیت جو عام طور پر کسی طویل علالت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ چند لمحے اسی عالم میں گزر جاتے ہیں۔ ہوا کی پُر اسرار سرگوشی کے علاوہ فضا میں سکوت ہے۔ یکایک کسی قدر دُور کسی چیز کے گرنے کا شور بلند ہوتا ہے عورت اپنے خیالات کے ہجوم سے چونک اٹھتی ہے اور مایوسی سے دبی ہوئی آواز میں پوچھتی ہے "کون ہے؟" —— کوئی جواب سنائی نہیں دیتا۔ کچھ وقفے کے بعد پلنگ کے نزدیک اندھیرے میں روشنی کا ایک دائرہ

سا لرزتا ہے جو پلنگ کے پاس روشنی میں پہنچ کر بالکل مدھم ہو جاتا ہے۔ عورت اپنا سوال دہراتی ہے اور پھر کسی کی آمد کو محض وہم سمجھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ دو تین لمحوں کے بعد پھر چونک پڑتی ہے اور دونوں ہاتھوں کے سہارے سر اُٹھاتی ہے۔ یکایک اس کے اُوپر کچھ بلندی پر ایک ہاتھ میں پستول نمودار ہوتا ہے اور اُس کے ساتھ ہی مدھم مگر بارعب آواز سنائی دیتی ہے۔ "خاموش" —— عورت سر اُٹھا کر اپنی دائیں جانب دیکھتی ہے اندھیرے میں ایک سایہ نظر آتا ہے —— اپنا سر دوبارہ تکیے پر رکھ کر وہ ہنسنے لگتی ہے اور دونوں ہاتھ پسلیوں پر رکھ لیتی ہے۔ جیسے درد محسوس کر رہی ہو۔ پستول اُس کی چھاتی کے قریب آجاتا ہے)

رت: (سائے کی طرف مخاطب ہو کر) بہت دیر سے آئے ہو!

واز: (مدھم مگر رعب دار) کیا مطلب؟

رت: افسوس اب یہاں کچھ بھی نہیں رہا — وہ سب کچھ لے جا چکے ہیں!

واز: وہ کون؟

رت: وہ —— اس گھر والے —— میرے عزیز —— میرے دُکھ سُکھ کے شریک اُور کون؟

واز: (طنزاً) سب کچھ لے جا چکے ہیں۔

رت: مجھے یقین ہے اب یہاں کچھ بھی نہیں ہوگا —— ڈھونڈ لو خاک بھی نہیں

ملے گا!

آواز: میں کہتا ہوں (پستول عورت کے سینے کے اور قریب آجاتا ہے) جان کا خوف نہیں ہے کیا؟

عورت: جان! وہ تو خود جا رہی ہے — صرف چند گھڑیوں کی مہمان ہوں!

آواز: ایسی فریب بازی خوب سمجھتا ہوں۔

عورت: یہ فریب بازی نہیں ہے — میں دھوکا نہیں دے رہی۔ مجھے مرتے دیکھ کر وہ سب کچھ لے کر چلے گئے۔ تمھیں چند دن پہلے آنا چاہئے تھا۔ کم از کم ایک دن ہی پہلے آجاتے۔ کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا۔ (کھانستی ہے)

آواز: چالاک عورت — جان عزیز ہے تو — فوراً بتا دو۔

عورت: عجیب کند ذہن ہو، کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ بارہا کہہ چکی ہوں کہ مر رہی ہوں تمھارا پستول صرف تھوڑی سی دیر کا فرق ڈال سکتا ہے اور کیا؟ (کھانستی ہے) ہائے۔

آواز: (طنزاً) تم مر رہی ہو اور گھر میں کوئی نہیں۔

عورت: کوئی بھی نہیں — تم آگئے اچھا ہوا۔ تنہائی میں سخت گھبرا رہی تھی اور دعا کر رہی تھی کہ آج تنہائی کے یہ لمحے کسی نہ کسی طرح کٹ جائیں!

آواز: معلوم ہوتا ہے ابھی تم اسے مذاق ہی سمجھ رہی ہو۔

عورت : مذاق ——؟ دُنیا میں کونسی چیز مذاق نہیں ہے —— یہاں تک کہ انسانی زندگی بھی ایک مذاق کے سوا کچھ نہیں۔

آواز : ٹھیک کہہ رہی ہو۔ بھلا اتنے بڑے گھر میں خاک ہوگا (لہجے میں طنز) بالکل خالی ہوگا!

عورت : (مجھ کو مرنے کے بعد) تو ڈھونڈ لو —— ڈھونڈ لونا ——!

واز : پھر اس کی کیا ضرورت ہے؟ (پستول فضا میں لہرایا جاتا ہے)

عورت : قطعاً کوئی ضرورت نہیں (ہمدردانہ لہجے میں) مجھے تم سے بڑی ہمدردی ہے (ہنس کر) ویسے اس عالم میں تمھاری آمد ایک عجیب حادثہ ہے! ایک اکیلی مرتی ہوئی عورت اور ایک چور۔

واز : میں کہتا ہوں ان باتوں سے کام نہیں چلے گا!

عورت : سچ کہو میرے سوا اس مکان میں کوئی اور زندہ چیز بھی دیکھی ہے تم نے؟ ——

واز : اس کا مطلب کیا ہے؟

ورت : کچھ نہیں۔ مجھے مرتے دیکھ کر سب چلے گئے (کھانستی ہے) مہربانی کرکے تکیہ میری پُشت سے لگا دو۔ آخری لمحوں میں دو چار باتیں کر لوں (بیٹھنے کی کوشش کرتی ہے) رکھ دو نا! سوچ کیا رہے ہو؟

(التجا انگیز نظروں سے اُدھر دیکھتی ہے)

ادھر کس وحشی سے واسطہ پڑا ہے۔ میں نے کہا ڈرو نہیں —— میں —— دھوکا نہیں دے رہی —— میں دھوکا نہیں دے سکتی! —— مرتی ہوئی عورت کی اتنی التجا بھی قبول نہیں کرو گے۔ مانا کہ تم چور ہو۔

آواز: اگر تم نے دھوکا دینے کی کوشش کی تو یاد رکھو ——

عورت: گولی مار دو گے۔ بھئی یہ حسرت نکال ہی لو —— کتنی بڑی بہادری کا کارنامہ ہوگا —— ایک مرتی ہوئی عورت کے سینے میں گولی مار دی ——

(کھانستی ہے) ہائے میرے اللہ!

آواز: (متاثر ہو کر) کیا کہتی ہو؟

عورت: یوں بیٹھ نہیں سکتی۔ تکیہ رکھ دو پشت کے پیچھے۔

آواز: بیٹھنے کی ضرورت کیا ہے؟

عورت: بیٹھ جاؤں تو کیا ہرج ہے؟

(چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا جاتی ہے جیسے چور کسی کشمکش میں گرفتار ہے)

پھر سوچ میں پڑ گئے ——!

(مرد کا چہرہ روشنی میں آتا ہے۔ وہ ایک ہاتھ سے تکیہ عورت کی پشت سے لگا دیتا ہے۔ عورت نیم دراز حالت میں بیٹھ جاتی ہے)

عورت: بہت بہت شکریہ۔

آواز: ہوں۔

عورت: تم نے ہزاروں مرتبہ چوری کی ہوگی —— کبھی ایسا حادثہ تو نہ ہوا ہوگا۔

(چور کا چہرہ اور ایک بازو روشنی میں)

چور: میں یہ معمّا سمجھ نہیں سکا۔

عورت: یہ معمّا کیا ہے بھلا؟

چور: تم تنہا ہو اور سخت بیمار ہو ——

عورت: (ہنس کر) یہ کیا معمّا ہوا بھلا۔ انہیں میری زندگی کی ضرورت تھی موت کی نہیں —— زندگی تھی۔ رہے میرے ساتھ ساتھ۔ جب دیکھا زندگی ختم ہو رہی ہے، چلے گئے! بس!

چور: تنہا چھوڑ کر چلے گئے!

عورت: اور کیا کرتے —— ہاں جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ لے گئے ہیں —— مگر تم بیٹھ کیوں نہیں جاتے؟ —— اوہ تم سمجھ رہے ہوگے یہ عورت یا تو دھوکا دے رہی ہے یا وقت ضائع کر رہی ہے حالانکہ دونوں باتیں نہیں

چور: تو پھر کیا ہے؟

عورت: میں نے سُنا ہے مرتے ہوئے انسان کی آرزو پوری کرنا ہر شخص اپنا فرض سمجھتا ہے —— اور غالباً چور بھی

چور: پھر کیا چاہتی ہو؟

عورت: (سوچ کر) تنہائی میں وحشت سی ہو رہی تھی۔ چاہتی تھی یہ درمیانی

وقفہ کسی خوشگوار طریقے سے گزر جائے۔ مگر اب یہ سوچتی ہوں اس طرح تمہارا وقت ضائع ہوگا۔ آخر تمہیں اپنا کاروبار بھی تو کرنا ہے — دل چاہے تو رہو ورنہ — یہ وقت کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائے گا۔

مرد: اتنی مایوس کیوں ہو؟

عورت: مایوس تو نہیں ہوں۔ مایوس ہونے کی وجہ بھی کیا ہے۔ زندگی کے خاتمے پر موت کے سوا اور ہے کیا؟ ایک حقیقت ختم ہو رہی ہے اور اس کی بجائے دوسری حقیقت اُبھر رہی ہے۔ زندگی اور موت — دنیا کی دو سب سے بڑی حقیقتیں۔ (کھانستی ہے) ایک گھونٹ پانی پی لوں تو کھانسی ختم جائے شاید۔

مرد: کہاں ہے پانی —؟

عورت: یہاں ہونا تو چاہیے — مگر نہیں ہوگا۔ باورچی خانے میں شاید مل جائے۔

مرد: لاتا ہوں۔

عورت: اُدھر دیکھنا الماری کے ساتھ سوئچ ہوگا۔ اگر وہ لوگ بلب نہیں لے گئے تو روشنی کر دو۔ بیٹری کی روشنی میں سوئچ ڈھونڈ لو!

(مرد اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے۔ تاریکی میں روشنی کا دائرہ لرزتا ہوا ایک طرف بڑھتا ہے۔ دو چار لمحوں کے لئے دیوار پر لگا ہوا "سوئچ بورڈ" روشنی میں آتا ہے۔ اُس کی طرف ہاتھ بڑھتا ہے۔ "کٹ" کی سی آواز آتی ہے۔

اور کمرہ روشن ہو جاتا ہے ــــ یہ کافی وسیع کمرہ ہے۔ فرش پر کہیں کہیں ٹوٹی پھوٹی بوتلیں اور میلے کچیلے کپڑے پڑے ہیں۔ دو تین کرسیاں بھی پڑی ہیں۔ ایک طرف تکیہ اور ایک جلد بھی پڑا ہے ــــ ادھر اُدھر راکھ بھی بکھری پڑی ہے ــــ

چند لمحوں کے بعد مرد واپس آتا ہے ــــ عمر بیتالیس اور پچاس کے درمیان ہو گی۔ چہرے پر محنت شاقہ کی وجہ سے سیاہی چھائی ہوئی ہے ــــ جسم پر ایک میلا کچیلا پاجامہ، ایک قمیص اور اس کے اوپر سیاہ رنگ کی واسکٹ ہے ــــ اُس کے دائیں ہاتھ میں شیشے کا گلاس ہے جو ایک طرف سے ٹوٹا ہوا ہے ــــ وہ گلاس اٹھائے ہوئے عورت کے پاس آتا ہے۔)

ورت: لے آئے۔ باورچی خانے سے (ہنس کر) آخر چور ہو۔

رد: (گلاس اُس کے ہونٹوں تک لے جاتے ہوئے) چور ہونے کا ایک فائدہ تو ہوا۔

ورت: (پانی کے دو گھونٹ پی لیتی ہے) امید ہے اب کھانسی رُک جائے گی۔ یہیں رکھ دو فرش پر ــــ ضرورت پڑے گی۔

(عورت گلاس مرد کے ہاتھ میں دے دیتی ہے۔ جسے وہ نیچے پلنگ کے قریب رکھ دیتا ہے)

مرد: کب سے بیمار ہو ———؟

(عورت اس کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ مرد کمرے کا جائزہ لینے لگتا ہے)

عورت: کیا پوچھا ہے تم نے ———:

مرد: (عورت کے چہرے پر نگاہیں جما کر) کب سے بیمار ہو؟

عورت: کافی عرصے سے

مرد: علاج وغیرہ نہیں ہوا!

عورت: بہت توجہ سے ——— میرے اپنوں نے بڑی جانفشانی سے تیمار داری کی مگر اس وقت تک جب تک انہیں یہ گمان رہا کہ میں موت کے منہ سے بچ جاؤں گی۔ جب اُنہیں یقین ہو گیا کہ میں زندگی کی آخری منزل پر پہنچ کر موت کا دروازہ کھٹکھٹانے لگی ہوں تو وہ مایوس ہو کر چلے گئے کیا کرتے بیچارے ——— صبح اُن میں سے ایک آئے گا۔ یہ دیکھنے کے لیے ——— کہ میں مر چکی ہوں یا ابھی کچھ سانس باقی ہیں۔ تجہیز و تکفین کا ناخوشگوار فرض بھی تو اُنہی کے سپرد ہے نا آخر ——— ابھی تک بیٹھے نہیں تم! ——— یہیں بیٹھ جاؤ۔

(مرد پلنگ کے ایک کونے پر بیٹھ جاتا ہے)

مجھے بجا طور پر تم پر رحم آتا ہے

مرد: رحم ———؟

عورت: اور کیا — تم واحد بدنصیب چور ہو جسے میرے یہاں سے کچھ نہیں ملا حالانکہ میری ساری زندگی چوروں کے درمیان گزری ہے اور ہر چور نے اپنی بساط کے مطابق مجھ سے اپنا حصہ وصول کیا ہے۔ اور میں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا — حیران کیوں ہو گئے ہو۔ سمجھے نہیں؟

مرد: نہیں!

عورت: میں نے ٹھیک ہی تو کہا ہے۔ میری ساری زندگی چوروں ہی کے درمیان گزری ہے۔ مگر تمہارے اور ان چوروں کے درمیان کچھ فرق ہے۔ وہ چور بھی رات ہی کے وقت آتے تھے۔ اپنوں اور بیگانوں سے چھپ کر اور تمہاری طرح میرا سامان نہیں — بلکہ میرے گوشت پوست سے کچھ چرانے آتے تھے — وہ جو کچھ مانگتے تھے — جو کچھ چرانا چاہتے تھے بڑی خوشی سے لے جاتے تھے۔ راتوں کی نیند، دل و دماغ کا سکون اور ان کے علاوہ روح کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی وہ چیز — جو ایک عورت کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے

مرد: تو تم —؟ (سمجھ چکا ہے مگر کتنا فضول سمجھتا ہے)

عورت: تھی — مگر اب تو صرف ایک مرتی ہوئی عورت ہوں۔ جب تک زندہ تھی یا یوں سمجھو جب تک دوسروں کے کام آسکتی تھی — ایک ندی تھی جہاں سے ہزاروں لوگ اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ مگر پیاس بجھاتے

وقت اپنی رُوح کی کثافت، اپنے خیالات کی گندگی بھی میری لہروں میں بہاتے رہے۔ میں اس کثافت کو، اس گندگی کو چپ چاپ اپنے سینے سے لگائے بہتی رہی۔ طوائف جو تھی —— (کھانستی ہے)

مرد: پانی کے دو گھونٹ پی لو۔

عورت: (کھانستے ہوئے) ہاں —— پلا دو۔ مہربانی!

(مرد گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیتا ہے۔ عورت دو تین گھونٹ پی لیتی ہے)

مرد: (بڑی ہمدردی سے) چپ چاپ لیٹ جاؤ۔

عورت: خاموش نہیں رہ سکوں گی۔ وحشت ہوگی —— مجھے بولنے ہی دو۔ خاموشی سے ہوگا کیا آخر —— وحشت، گھبراہٹ —— سو بھی نہیں سکتی۔

مرد: کوشش کرو۔

عورت: نہیں —— موت سے پہلے نیند؟ دو چار باتیں کرلوں

(مرد ہمدردی سے تکیہ ٹھیک کر دیتا ہے)

مرد: اب ٹھیک ہے تکیہ؟

عورت: (مسکرا کر) بھول گئے ——؟

مرد: کیا ——؟

عورت : کہ تم ایک چور ہو

مرد : اور تم ایک طوائف۔

عورت : ہاں۔ اس شہر کی مشہور طوائف زہرا۔

مرد : مگر میں اس وقت چور نہیں ہوں — صرف ایک انسان ہوں!

عورت : انسان — (آہ بھر کر) کتنے لمبے عرصے کے بعد — بلکہ زندگی میں شاید پہلی مرتبہ میری رُوح میں ایک مٹھاس سی ٹپک پڑی ہے۔ انسان — کاش دُنیا کا ہر انسان اپنے آپ کو انسان سمجھ لے (مایوسی سے) مگر ایسا ہوگا نہیں — ایسا ہو نہیں سکتا۔

(مرد انگلیوں سے اُس کے رُخسار پونچھتا ہے۔ جو کھانسی کی وجہ سے گیلے ہو گئے ہیں۔ عورت احسان مندانہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتی ہے)

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم چور نہیں — کوئی معزز آدمی ہو — مہذب سوسائٹی کے کوئی معزز رُکن تو تمہیں کبھی ٹھہرنے کے لئے نہ کہتی۔ ہم لوگ — چور ڈاکو، شرابی، جسم بیچنے والے — سماج کے جسم پر پھوڑے ہیں — پھر بھی کبھی کبھی انسان بن جاتے ہیں!

مرد : کچھ بھی — ہم سے زندہ رہنے کا حق کوئی نہیں چھین سکتا۔

عورت : زندہ رہنے کا حق دیا بھی کس نے ہے — ہمیں؟

مرد : حوصلہ نہ ہارو — لمبی بیماری نے تمہیں مایوس کر دیا ہے!

عورت : (لہجے میں جذباتی شدت) تو صاحب کیا ہاروں گی ـــــ میں زندگی کی بازی ہی ہار چکی ہوں ـــــ سب سے پہلی شکست اُس وقت ہوئی تھی جب میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اُس عورت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ جو میرے اندر موجود تھی ـــــ (عالم خیال میں) جب پہلی مرتبہ ایک ہوس آلود ہاتھ نے میرے جسم کو جھنجھوڑا تو وہ عورت خون میں شرابور، سسکتی ہوئی، تڑپتی ہوئی عورت میری دُنیا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلی گئی ـــــ عورت مر گئی اور ایک طوائف رہ گئی ـــــ معاف کرنا بڑی جذباتی بن گئی ہوں۔ سوچے سمجھے بغیر جو دل میں آتا ہے کہہ دیتی ہوں۔

(مرد خاموش ہے۔ دو چار لمحے خاموشی رہتی ہے)

اب وقت کیا ہوگا ـــــ ؟

مرد : رات بیت رہی ہے۔

عورت : زندگی کی آخری رات ـــــ اکثر سوچا کرتی تھی کہ زندگی کی آخری رات میں انسان کیا کچھ سوچتا ہے ـــــ اس کے دل میں کیسے خیالات اُمڈتے ہیں آج رات سب کچھ معلوم ہو گیا۔

مرد : ایسی حالت میں انہیں چھوڑ کر نہیں جانا چاہئے تھا!

عورت : پھر وہی پہلا سوال۔ صاحب! وہ کیوں نہ جاتے۔ ان سے میرا کوئی خونی رشتہ تو تھا نہیں۔ قدرت کی ستم ظریفی نے ہمیں ایک جگہ اکٹھا کر دیا

تھا۔ وہ میرے اُستاد تھے — ایک بوڑھی اور تجربہ کار عورت تھی، جو مجھے بیٹی کہہ کر پکارتی تھی — اور پھر اس کے کچھ عزیز تھے۔ وہ ایک میرے چاہنے والے بھی تھے۔ جو گھر بار چھوڑ کر میرے دوارے آ گئے تھے۔ میری تجربہ کار ماں نئے نئے گاہک لاتی تھی — مجھے نئے نئے ڈھنگ بتاتی تھی، اُستاد فن کے نئے نئے سبق سکھاتے تھے۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا اُس وقت تک ہوتا رہا۔ جب تک میرے جسم کی شادابی اُن کے ارادوں کا ساتھ دیتی رہی۔ جب شادابی ختم ہو گئی — جب توانائی جاتی رہی تو وہ جدھر سے آئے تھے اُدھر چلے گئے۔ اُن پرندوں کی طرح جو خوراک کی تلاش میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچ جاتے ہیں — اور خوراک حاصل کرنے کے بعد پھر واپس چلے جاتے ہیں — مگر مجھے اُن سے شکوہ نہیں — کوئی شکایت نہیں۔ ایسا اکثر ہوتا رہا ہے۔ ایسا اکثر ہوتا رہے گا!

مرد: (ہمدردی سے اُس کے قریب کھسک کر) کس قدر خود غرض ہے دُنیا۔

عورت: میرے قریب مت آؤ — سانس میں بھی تو جراثیم ہوتے ہیں۔

مرد: میں جراثیم سے نہیں ڈرتا۔

عورت: موت سے تو ڈرنا چاہئے — (کھانستی ہے) ابھی پانی ختم تو نہیں ہوا؟

مرد: کچھ ہے، پیو گی؟

(مرد گلاس اُس کے ہونٹوں سے لگاتا ہے)

عورت: کسی نے سچ کہا ہے۔ مرتے وقت بیتا ہوا زمانہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ایسی ایسی باتیں یاد آجاتی ہیں جو عرصہ ہوا دماغ سے غائب ہو چکی تھیں۔

مرد: اپنا ماضی یاد کر رہی ہو۔ کیا فائدہ؟ بیتا زمانہ یاد کرنے سے تکلیف ہوگی۔

عورت: میں کیا کروں؟ پچھلی باتیں تو ایک طوفان کی طرح دماغ میں اُمڈ پڑی ہیں۔

مرد: اگر خاموش رہو تو خود بخود سکون آجائے گا۔

عورت: یہ بات ممکن نہیں ہے۔

مرد: میں نے اپنے ماضی کو کبھی یاد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میری زندگی میں صرف ایک ہی زمانہ ہے۔ حال، صرف حال۔ میں نے نہ کبھی پیچھے مُڑ کر بیتے زمانے کی طرف دیکھا ہے اور نہ کبھی مستقبل کے بارے میں سوچا ہے۔

عورت: میں ابھی اسی طرح اپنے آپ کو فریب دیتی رہی ہوں زندگی کی مصروفیتوں میں سب کچھ بھلا دیا۔ مگر اب —— مگر اس وقت، اُف میرے اللہ!

مرد: (بے چین ہو کر) کیا ہوا؟

عورت: وہی —— درد!

مرد: چھاتی میں؟

عورت: ہاں

مرد: ڈاکٹر کو بلا لاؤں!

عورت: ڈاکٹر کیا کرے گا — یہ قصّہ چھوڑ دو بابا!

مرد: چُپ چاپ لیٹ جاؤ۔ ممکن ہے نیند آجائے۔

عورت: نیند آنے میں ابھی کچھ وقت ہے۔

مرد: پھر مایوسی۔

عورت: نہیں۔ یہ مایوسی نہیں ہے۔

مرد: بہرحال جو کچھ بھی ہے تمہاری موجودہ حالت کے لئے بہتر نہیں ہے۔

عورت: ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سینے میں اک طوفان سا اُمڈ پڑا ہے۔

مرد: درد بڑھتا جا رہا ہے۔ جبھی تو کہتا ہوں ڈاکٹر کو بلا لاؤں۔

عورت: کھڑکی کا دوسرا پٹ بھی کھول دو۔

مرد: (کھڑکی کا دوسرا پٹ کھولتے ہوئے) اس وقت باہر کیا ہے۔ اندھیرا ہی اندھیرا۔ کیا دیکھ سکو گی؟

عورت: فضا میں کوئی ستارہ نظر نہیں آتا — چاند بھی ایک مدقوق جسم کی طرح کانپ رہا ہے۔ بھیانک اندھیرا اس مدقوق جسم کو بھی نگل ڈالے گا۔

مرد: صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔

عورت: تو پھر تمہیں چلے جانا چاہئے۔

مرد: کیوں؟

عورت: یہ بات بھی نہیں جانتے —— اس طرح گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو میری طرف؟

مرد: نہیں تو۔

عورت: کمزور ہونے کے باوجود میں تمہاری نگاہوں کا سوال پڑھ سکتی ہوں کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟

مرد: کوئی خاص بات تو نہیں۔

عورت: شاید یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ میں طوائف بننے سے پہلے کیا تھی؟

مرد: نہیں۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہاری کس طرح مدد کروں!

عورت: تمہاری یہی نیت بڑی مدد ہے —— کیوں اس وقت اپنا وقت ضائع کر رہے ہو؟

مرد: آج رات مجھے اس کا افسوس نہیں ہے۔

عورت: تمہیں اس کا افسوس نہیں ہے (کھانستی ہے) اوہ کتنے اچھے ہو!

مرد: میں تمہیں اس تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ آخر تم کیوں نہیں اس بات پر راضی ہو جاتیں کہ میں ڈاکٹر کو بلا لاؤں۔

عورت: ڈاکٹر —— ڈاکٹر کیا کر سکتا ہے؟

مرد: پھر بھی —— تکلیف کسی قدر کم ہو جائے گی۔

عورت: اب تکلیف کم نہیں ہو گی — اب تکلیف کم نہیں ہو سکتی — اوہ!

مرد: خواہ مخواہ تکلیف اٹھا رہی ہو۔

عورت: یہ سینے کا درد نہیں ہے (دریا پر نگاہیں جما دیتی ہے)

مرد: تو پھر —؟

عورت: اوہ میرے اللہ! آج پھر — آج پھر تم آ گئیں۔

مرد: کون؟

عورت: وہی معصوم لڑکی — جو آج ایک طوائف بن چکی ہے۔

مرد: میں کہتا ہوں بیتا زمانہ یاد نہ کرو۔ اپنی پچھلی زندگی کو کُریدنے کا مقصد کیا ہے

عورت: میں نے مُڑ کر نہیں دیکھا — میں اپنے ماضی سے دُور رہنا چاہتی
ہوں — ہزاروں میل دُور — اس قدر دُور جہاں سے میں اس کی
ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکوں۔ مگر وہ لڑکی!

مرد: خیالات کا رُخ کسی اور طرف پھیر دو۔

عورت: وہ پہلے میرے خوابوں میں آیا کرتی تھی — مگر آج میں اُسے اپنی
آنکھوں کے سامنے بیداری کے عالم میں دیکھ رہی ہوں۔

مرد: پچھلا زمانہ یاد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے — اس لڑکی کو
آنکھوں سے ہٹا دو۔

عورت: کس طرح — آخر کس طرح؟ نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اب ایسا

نہیں ہو سکتا۔ دیکھو وہ بالکل سامنے کھڑی ہے۔

مرد: تو پھر؟

عورت: سارا نقشہ میری نگاہوں کے سامنے آگیا ہے —— میں سب کچھ دیکھ رہی ہوں۔

مرد: کس طرح سمجھاؤں تمہیں۔

عورت: باپ کے مرنے کے بعد یہ بھولی بھالی لڑکی ایک یتیم خانے میں آ گئی ہے۔ نگاہیں جھکائے چپ چاپ یتیم خانے کی چار دیواری میں پھر رہی ہے —— اور اب —— اب دیکھو یتیم خانے کا منیجر اس لڑکی کو چند سکوں کے عوض ایک موٹی اور کالی کلوٹی عورت کے سپرد کر رہا ہے —— ایک طوائف نے کچھ روپے دے کر اس کی معصومیت، اس کی دوشیزگی، اس کی روح کی پاکیزگی خرید لی ہے۔ اب وہ لڑکی اس طوائف کے گھر میں ہے۔ ہوس آلود نگاہیں رات دن اس کا تعاقب کر رہی ہیں وہ بھاگنا چاہتی ہے مگر بھاگ نہیں سکتی —— اور آخر ایک دن وہی ہوتا ہے جو ہونا چاہیے تھا۔ جس کے لئے وہ خرید کر اس گھر میں لائی گئی ہے۔ جو عورت کی سب سے قیمتی چیز ہے دور ہوتی جا رہی ہے —— وہ گھٹتی جا رہی ہے —— وہ تباہ ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا خوبصورت جسم رات دن ہوس آلود نگاہوں کے تنوروں میں تپتا جا رہا ہے۔

ہزاروں انسانی شکل والے گدھ اس کے خوبصورت جسم کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں —— وہ شاداب جسم جنسی بیماریوں کی ہر گھڑی تپتی ہوئی گندگی کو اپنے اندر سمیٹے مسکرا رہا ہے۔ ہنس رہا ہے۔ قہقہے لگا رہا ہے —— (ایک دم کھانستی ہے۔ سانس اُلجھنے لگتا ہے) اور ——

رد : خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ۔ کیوں چھاتی پر بوجھ ڈال رہی ہو؟

ورت : (بدستور دروازے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے) وہ لڑکی واپس آنا چاہتی ہے مگر آ نہیں سکتی —— ہزاروں ہاتھوں نے اُس کا دامن پکڑ رکھا ہے کس طرح بھاگے کس طرح اپنی دنیا میں واپس جائے۔ اس کے چاروں طرف لوگ کھڑے ہیں۔ ان سب کی شکلیں آج نگاہوں کے سامنے پھر رہی ہیں (خلا میں ایک طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) وہ لمبی داڑھی والا یتیم خانے کا وہی مینیجر ہے جس نے چند سکّوں کے عوض اُس بے کس اور یتیم لڑکی کو گناہ کے جہنم میں دھکیل دیا تھا —— یہ نورانی داڑھی والا وہ مولوی ہے جس نے اکثر یتیم خانے میں آ کر یتیموں کو جنّت کی خوش خبری سُنائی تھی اور یہ موٹا آدمی شہر کا سب سے زیادہ خیرات دینے والا رئیس ہے —— اور یہ سُرخ چہرے والا شخص ہماری قومی جماعت کا سیکرٹری ہے یہ لوگ راتوں کی تاریکی میں چھُپ چھُپ کر آتے ہیں اور اپنی پیاس بجھا کر چلے جاتے ہیں —— یہ معزز لوگ بدستور معزز ہیں۔ ساری دُنیا اُن کی عزت

کرتی ہے۔ مگر وہ عورت —— وہ ایک طوائف ہے۔ ایک قابلِ نفرت رنڈی، ایک ذلیل، بیسوا —— ایک —— (زور سے کھانستی ہے)

مرد: (اُس کا ہاتھ پکڑ کر) خدا کے لئے اِن باتوں کو بھلا دو۔

عورت: اوہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔

مرد: اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔

عورت: اچھا ہوا دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا ہے۔

مرد: اور سینے کے درد میں کچھ کمی ہوئی ہے؟

عورت: تم کیوں اپنے آپ کو پریشان کر رہے ہو۔

مرد: تمہاری تکلیف دیکھ کر میں پریشان ہوں۔

عورت: شکریہ —— خدا جانے تم کون ہو؟

مرد: ایک چور —— مگر آج رات تو میں صرف ایک انسان ہوں —— جس طرح تم ایک انسان ہو۔

عورت: چور بننے سے پہلے تم کیا تھے؟

مرد: ایک مال دار گھرانے میں معمولی نوکر۔

عورت: پھر؟

مرد: میں بچوں کو کھلایا کرتا تھا۔ ایک دن بچوں کے تند مزاج باپ نے مجھ پر چوری کا الزام لگا کر گھر سے نکال دیا —— میں نے ناکردہ گناہ کی معافی

مانگ لی۔ پھر وہیں چلا گیا۔ چند دن کے بعد اس کی سونے کی گھڑی گم ہو گئی۔ مجھے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔

عورت: افسوس۔

مرد: جب میں جیل سے نکلا تو کوئی شخص بھی مجھے نوکر رکھنے پر رضامند نہ ہوا کیونکہ میں مجرم سمجھا جا رہا تھا —— کیونکہ میں چور سمجھا جا چکا تھا۔ میں بھوکا مرنا نہیں چاہتا تھا —— میں نے سوسائٹی کی خیرات پر زندگی بسر کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ میں وہی بن گیا جو لوگ مجھے سمجھتے ہیں۔

عورت: ایک چور۔

مرد: مجھ سے زندہ رہنے کا حق کون چھین سکتا تھا؟

عورت: میں نے اکثر اس مسئلے پر غور کیا ہے

مرد: کس مسئلے پر؟

عورت: اس مسئلے پر کہ انسان چور کیوں بن جاتا ہے۔ انسان گناہ کے کنوئیں میں کیوں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ مجھے اس کی صرف ایک ہی وجہ نظر آئی ہے اور وہ ہے سوسائٹی کا موجودہ نظام۔ اگر دنیا میں ہر شخص کو اس کا جائز حق مل جائے —— اگر ہر شخص آبرومندانہ زندگی بسر کر سکے تو یہاں جرم کا نشان بھی باقی نہ رہے (ہنس کر) کیا عجیب اتفاق ہے ایک گری ہوئی طوائف کی ایک چور سے ملاقات ہو جاتی ہے اور طوائف جرم کے

فلسفے پر غور کرکے اپنی رائے بتا رہی ہے۔ اس قسم کی باتیں تو اُن لوگوں کو زیب دیتی ہیں جو مجرم کے جرم کو دیکھتے ہیں، مجرم کے پیٹ کو نہیں۔ اگر سماج کسی ایک شخص سے زندہ رہنے کا حق چھین لے تو وہ پھر زندہ رہنے کے لیے کیا [illegible] سوسائٹی کو، ایسے نظام کو ختم کر دینا چاہیے۔

مرد: تم بہت [illegible] ہو گئی ہو۔

عورت: تنہائی میں اکثر میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔

مرد: خواب ـــــ؟

عورت: اپنی مصروفیتوں میں جب کبھی تنہائی کا موقع ملتا تو میں ایک خوشگوار خواب میں ڈوب جاتی ـــــ ایک بڑے دل کش، ایک بڑے حسین خواب میں پہروں ڈوبی رہتی!

مرد: دُنیا کا ہر کچلا ہوا شخص سنہرے خواب دیکھا کرتا ہے۔

عورت: (آنکھیں بند کرکے) ایک خوبصورت مکان، فضا میں چمکتا ہوا سورج، ہوا میں لہراتی ہوئی ٹہنیاں، مسکراتے ہوئے پھول، محبت کے رس بھرے گیت ـــــ اور ایک سچی محبت کرنے والے کی آغوشِ اُلفت، کیا عجیب خواب ہے۔ ایک طوائف بھلا ایسے خواب بھی دیکھ سکتی ہے؟

مرد: یہ ہم سب کا مشترکہ خواب ہے۔

عورت: مشترکہ خواب! تم بھی یہ خواب دیکھا کرتے ہو؟

مرد : یہ خواب ہماری زندگی کا عزیز ترین اثاثہ ہے۔

عورت : خواب ـــــ صرف خواب۔

مرد : میں مایوس نہیں ہوں۔

عورت : (حیرت سے) کیا؟

مرد : مجھے اُمید ہے یہ خواب پُورا ہو گا۔

عورت : کب؟

مرد : جب سوسائٹی کا نظام بدل جائے گا۔ جب دولت، عزت اور زندگی کی مسرتیں صرف چند لوگوں ہی میں نہیں ـــــ سب لوگوں میں تقسیم ہوں گی جب ہر شخص زندگی سے محبت کرے گا۔ وہ وقت آنے والا ہے وہ وقت آ رہا ہے۔

عورت : وہ وقت آ رہا ہے ـــــ اوہ

مرد : (بڑے پیار سے عورت کے بالوں کو اس کے رُخساروں سے ہٹاتے ہوئے) یہ امید ہر کچلے ہوئے انسان کے دل میں جاگ اٹھی ہے

عورت : میں خواب تو نہیں دیکھ رہی؟

مرد : نہیں۔ ـــــ تم بیدار ہو۔

(مرد پلنگ پر بیٹھ کر عورت کا سر اپنے زانو پر رکھ لیتا ہے)

عورت : میرا سر تمہارے زانو پر ـــــ یہ خوشگوار لمحے۔

مرد : (پیار سے اُس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے) اب درد کا کیا عالم ہے؟

عورت : (اپنے خیال میں) خوشگوار لمحے، ہنستے ہُوئے پھول، ہوا میں لہراتی ہوئی ٹہنیاں، محبت کے رس بھرے گیت —— اوہ! (شدتِ درد سے سینے پر ہاتھ رکھ لیتی ہے)

مرد : کیا ہُوا؟

عورت : (بدستور عالمِ خیال میں) روشنی، خوشی —— گیت، محبت ——

(عورت کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں جسم سرد ہو جاتا ہے)

مرد : زہرا (گھبرا کر) زہرا!

آنسو اور ستارے

کردار:

- ○ غیاث
- ○ ڈاکٹر
- ○ صُغریٰ
- ○ مُمتاز

منظر

شیخ غیاث احمد کے گھر کا ایک کمرہ

سامان مختصر اور معمولی مگر بڑے قرینے سے رکھا گیا ہے۔ شمالی دیوار میں ایک دروازہ جو صحن میں کھلتا ہے۔ کمرے میں صرف یہی ایک دروازہ ہے۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے ہوں گے۔ یہ موسم سرما کی رات ہے۔ کھڑکیاں بند ہیں اور کمرے کے وسط میں ایک انگیٹھی کے اندر سُرخ سُرخ کوئلے کمرے کی فضا کو گرم کئے ہوئے ہیں۔

ایک طرف ایک پلنگڑی بچھی ہے۔ جس میں آٹھ ماہ کا ایک بچہ آنکھیں بند کئے پڑا ہے۔ پلنگڑی کے پاس غیاث احمد اور ڈاکٹر کھڑے ہیں۔ غیاث احمد بچے کو فکر مندانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ ڈاکٹر بچے کی نبض دیکھتا ہے نبض دیکھنے کے بعد آہستہ سے بچے کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے۔ جیب سے سٹیتھسکوپ (سینہ بین) نکال کر بچے کی چھاتی کا جائزہ لیتا ہے۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔

غیاث: کیوں ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر: کچھ فرق ہے، کل جیسی حالت نہیں۔

غیاث: چھاتی ---!

ڈاکٹر: کل جیسی نہیں، دو ایک دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔

غیاث: کتنا زرد ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر: یہ تو ہوتا ہی ہے۔

غیاث: کوئی فکر کی بات نہیں ہے نا؟

ڈاکٹر: فکر نہ کیجئے۔ میں نے کہا نا، جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ نسخہ لکھے دیتا ہوں۔ وہی پڑیاں اور مکسچر دینا ہے۔ وہ ختم ہو گئی ہوگی!

غیاث: جی ہاں۔

ڈاکٹر: کل دوپہر کو دھوپ میں پُشت پر سفید تیل بھی لگا دیجئے۔

(ڈاکٹر نسخہ لکھ کر کاغذ غیاث کو دے دیتا ہے)

غیاث: ڈاکٹر صاحب دُودھ؟

ڈاکٹر: ایک حصّہ دُودھ میں دو حصّے پانی۔

غیاث: دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر: غیاث صاحب! یہ بچّہ آپ کا لے پالک ہے۔

غیاث: میرا تو نہیں، بہن کا ہے۔ میرا ہی سمجھ لیجئے۔ اس سے اتنی محبت ہے جتنی ایک حقیقی باپ کو ہو سکتی ہے۔ اس کی ماں ہسپتال میں اس کی پیدائش کے فوراً بعد مر گئی تھی۔ باپ بھی زندہ نہیں تھا۔ ہم ہسپتال والوں کی منت

سماجت کر کے لے یہاں سے آئی —— ہم دونوں کو اس کا بڑا خیال رہتا ہے۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر: آپ دونوں کو اس کی بڑی فکر ہے!

غیاث: دل بہل گیا ہے۔ غم غلط ہو گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میرا بچہ مر گیا تھا اور ان کے کوئی بچہ تھا ہی نہیں۔

ڈاکٹر: فسادات میں مرا تھا آپ کا بچہ؟

غیاث: فسادات سے کچھ پہلے۔ ان فسادات میں جو کچھ ہوا اس کی داستان بڑی دردناک ہے۔ سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ بیوی کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں ملا۔ کبھی سوچتا ہوں، مار ڈالی گئی ہو گی۔ پھر خیال آتا ہے شاید زندہ ہو اور یہ دوسرا خیال سوہان روح ثابت ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر: مر چکی ہو گی۔

غیاث: ظاہر تو یہی ہوتا ہے، مگر دل مانتا نہیں۔ ہر روز اخبار دیکھتا ہوں کہ بازیافتہ خواتین کی فہرست میں اس کا نام بھی نظر آ جائے مگر نہیں اب تک اس کا نام نظر نہیں آیا۔

ڈاکٹر: یقیناً اس دنیا میں نہیں ہو گی (بیگ اٹھاتے ہوئے) اچھا نوکر کو بھیج دیجئے۔

غیاث: خود لے آؤں گا۔ نوکر تو سو گیا ہے۔ کیا ضرورت ہے جگانے کی۔

ڈاکٹر: یقین ہے صبح تک اور فرق نظر آ جائے گا۔ اطلاع دیجئے گا۔

یاث : بہتر۔

(ڈاکٹر کمرے سے نکل جاتا ہے۔ غیاث دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر دیکھتا ہے یہ تصویر ممتاز کی ہے۔ دو تین لمحے تصویر دیکھنے کے بعد وہ کرسی پر گر پڑتا ہے اور کسی گہری سوچ میں غرق ہو جاتا ہے۔

صغریٰ آتی ہے۔ صغریٰ چھریرے بدن کی عورت ہے رنگ کھلتا ہوا سن چوبیس کے لگ بھگ۔ غیاث ابھی تک سوچ میں غرق ہے اسے بہن کی آمد کا علم نہیں ہے)

صغریٰ : چلے گئے ڈاکٹر صاحب۔ کیا کہا اُنہوں نے ؟

غیاث : (چونک کر) نہیں میں کچھ سوچ تو نہیں رہا۔

صغریٰ : بھائی جان !

غیاث : نوکر سو رہا ہو گا۔ خود ہی جاؤں گا۔ قریب ہی تو ڈسپنسری ہے

صغریٰ : بات کیا ہے بھائی جان ! کیا کہا ڈاکٹر صاحب نے ؟

غیاث : کہتے ہیں دو ایک روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔

صغریٰ : آپ سوچ کیا رہے ہیں۔ اتنی فکر کیوں کرتے ہیں ننھے کی۔ جب ڈاکٹر نے یقین دلا دیا ہے تو پھر فکر کیسی !

غیاث : میں ننھے کے بارے میں فکرمند نہیں ہوں۔

صغریٰ : تو پھر سوچ کیا رہے ہیں ؟

غیاث: آج یونہی ایک خیال ذہن میں آ گیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے ممتاز اپنی سالگرہ کا دن کتنے اہتمام سے منایا کرتی تھی۔ اور آج اس کی سالگرہ کا دن تھا۔ ۹ جنوری —— ہم دونوں سالگرہ کے موقع پر ایک دوسرے کو تحفہ دیا کرتے تھے۔ آج یک لخت پرانی یادیں ذہن میں اُمڈ پڑی ہیں۔ کاش مجھے صرف یہ معلوم ہو جائے کہ وہ زندہ ہے یا ——

صُغریٰ: بھائی جان، اگر وہ زندہ ہو تو؟

غیاث: زندہ ہو —— (غم سے بوجھل پلکیں اُٹھا کر بہن کو دیکھتے ہوئے) سب سے بڑا غم تو یہی ہے۔

صُغریٰ: (یہ محسوس کر کے کہ بھائی کو اس ذکر سے صدمہ پہنچتا ہے) بھائی جان! ڈاکٹر کہتا ہے بچہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔

غیاث: (اپنے خیال میں) دُنیا میں کتنے بڑے دُکھ ہیں۔ انسان کس طرح دوسرے انسان کو تباہ کر دیتا ہے۔ کتنی بے دردی، کتنی سفاکی کے ساتھ۔ پھر بھی انسان اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہتا ہے —— اشرف المخلوقات —— آج کے انسان میں تو انسانیت رہی ہی نہیں۔

صُغریٰ: بھائی جان، ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟

غیاث: (چونک کر) کیا پوچھا ہے تم نے —— ڈاکٹر، ہاں ڈاکٹر کہتا تھا۔ دو دو گھنٹے کے بعد ایک پڑیا کھلا دینا —— دوا لے آتا ہوں۔

غریٰ: آپ آرام کیجئے بھائی جان! محمود لے آئے گا۔

یاث: ابھی لے آتا ہوں۔ قریب ہی تو ڈسپنسری ہے۔

(غیاث کمرے سے نکل جاتا ہے۔ صغریٰ اُسے جاتے ہوئے دیکھتی ہے پھر بچے کے پاس پہنچتی ہے، جھک کر اُسے دیکھتی ہے اور کُرسی پر بیٹھ جاتی ہے چار پانچ لمحے گزر جاتے ہیں۔ ممتاز دروازے پر آتی ہے۔ جھانک کر اندر دیکھتی ہے صغریٰ تیزی سے اس کے پاس پہنچتی ہے)

تاز: (سرگوشی سے) کوئی ہے تو نہیں؟

غریٰ: آ جاؤ۔

متاز: سو گئے۔

غریٰ: نہیں بچے کے لئے دوا لینے گئے ہیں۔

متاز: جلدی آ جائیں گے؟

غریٰ: دروازہ بند کر دیتی ہوں۔

(ممتاز اندر آتی ہے۔ صغریٰ دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دیتی ہے۔ ممتاز مڑ کر دروازے کو دیکھتی ہے۔ پھر بچے کی پلنگڑی کے نزدیک پہنچ کر بچے کو محبت سے دیکھتی ہے)

متاز: کیا حال ہے اب۔ کچھ فرق تو ضرور معلوم ہوتا ہے۔

غریٰ: ہاں کافی فرق ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے، دو ایک روز تک بالکل ٹھیک

ہو جائے گا۔

ممتاز: رنگ ابھی زرد ہے

صغریٰ: ٹھیک ہو جائے گا!

ممتاز: (صغریٰ کو احسان مند نگاہوں سے دیکھ کر) بڑی تکلیف اٹھائی ہے تم نے۔ آخری سانس تک تمہارا احسان نہیں بھولوں گی ——— ان کے آنے سے پہلے پہلے مجھے واپس چلا جانا چاہئے۔

صغریٰ: جب دروازہ بند ہے تو پھر فکر کی ضرورت کیا ہے؟ جس وقت دروازہ کھٹکھٹائیں تم ادھر الماری کے پیچھے چلی جانا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے جائیں گے۔ پھر صبح تک نہیں آئیں گے!

ممتاز: ایک ایک لمحہ جو میں یہاں گزارتی ہوں میرے لئے کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔

صغریٰ: یہ صرف اسی لئے کہ تم اپنے آپ کو مجرم سمجھتی ہو۔

ممتاز: مجرم اپنے آپ کو مجرم نہ سمجھے تو اور کیا سمجھے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں سمندر کے کنارے ریت کا ایک گھروندا بنا رہی ہوں کسی نہ کسی وقت ایک تند و تیز لہر آئے گی اور اس گھروندے کو بہا کر لے جائے گی۔ میرا یہاں آنا میرے لئے نہیں اس معصوم کے لئے بھی سخت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ کئی بار ارادہ کیا کہ آئندہ یہاں نہیں آؤں گی۔ مگر مامتا

چین نہیں لینے دیتی۔

غریٰ: کاش تم بھائی جان کے سینے میں جھانک سکتیں۔ تمہیں معلوم ہو جاتا۔ بھائی جان وہ نہیں ہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔

تاز: سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ایک ہی طرح سوچتے ہیں، ایک ہی طرح عمل کرتے ہیں۔

غریٰ: یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو؟

تاز: اب تک اس قسم کی بدنصیب عورتوں کے ساتھ مردوں نے کیا سلوک کیا ہے تم اس سے واقف نہیں ہو!

غریٰ: بھائی جان ان مردوں سے مختلف ہیں۔ تمہارے آنے سے پہلے کہہ رہے تھے۔ آج ممتاز کی سالگرہ کا دن ہے۔ سالگرہ کے موقعے پر ہم ایک دوسرے کو تحفے دیا کرتے تھے۔ جب وہ یہ الفاظ کہہ رہے تھے تو میں محسوس کر رہی تھی کہ ان کے سینے میں آنسوؤں کا سیلاب موجزن ہے۔

متاز: یہ سیلاب غصّے کے شراروں میں بھی تبدیل ہو سکتا ہے۔

غریٰ: جی چاہتا ہے آج یہ دیوار ہٹا دوں، ان سے صاف صاف کہہ دوں! بھائی جان! ممتاز زندہ ہے، یہ اس کا ——

متاز: (بے تاب ہو کر) صُغریٰ!

غریٰ: بھابی!

مُمتاز: اپنا وعدہ بھول گئی ہو — چاہتی ہو کہ میں زندہ نہ رہوں؟ چاہتی ہو کہ یہ پھول نفرت سے اُٹھا کر کسی یتیم خانے میں پھینک دیا جائے؟؟

صُغریٰ: نہیں بھابی!

مُمتاز: تو پھر خاموش رہو۔ ایک لفظ بھی زبان پہ نہ لاؤ۔ اگر تمہیں میرا کچھ خیال ہے اگر اس معصوم کی مسرتوں کا خیال ہے تو سمجھ لو وہ بدنصیب عورت مر چکی ہے۔ جو کبھی تمہاری بھابی تھی۔ جس کا نام ممتاز تھا۔

صُغریٰ: آج انھوں نے کہا تھا انسان، انسان پر کس بے دردی اور سفاکی سے ظلم کرتا ہے اور پھر بھی انسان اپنے آپ کو اشرف المخلوقات بھی کہتا ہے دیکھو تو تمہاری تصویر انھوں نے دیوار پہ لگا رکھی ہے — روز اسے دیکھتے ہیں۔ یہ دیکھو اخبارات کا انبار، ان کی نظریں ہر پرچے میں تمہارا نام تلاش کرتی رہتی ہیں انہیں ابھی تک یقین ہے کہ تم ایک روز آ جاؤ گی۔

مُمتاز: اگر انہیں اس بات کا علم ہو جائے کہ بعض آنے والیاں اپنے ساتھ اپنی بدقسمتی کا بوجھ بھی اُٹھا کر لے آتی ہیں اور میں بھی انہی عورتوں میں شریک ہو چکی ہوں تو پھر ان کا رویّہ بالکل بدل جائے۔ پھر ان کی نظریں بازیافتہ خواتین کی فہرست پر نہ پڑیں۔ پھر یہ تصویر اس دیوار پہ آویزاں نہ رہے پھر انہیں کبھی سالگرہ کی یاد بھی نہ ستائے۔

صُغریٰ: لیکن یہ کس جرم کی سزا ہو گی؟

ناز: یہ اس جرم کی سزا ہوگی جسے ایک عورت کی بے کسی اور مجبوری کہا جاتا ہے۔ تم لوگ جالندھر سے آ گئے۔ مگر میرے راستے میں درندہ نما انسان برچھیاں تان کر کھڑے ہو گئے۔ پھر مجھے ایک چار دیواری میں بند کر دیا گیا ——— میں کیا کر سکتی تھی۔ ایک بے کس و مجبور عورت کیا کر سکتی تھی اور پھر ایک مدت کے بعد جب ایک انسان نے مجھے پاکستان کی سرحد پر پہنچایا تو میں اپنے وجود کے اندر اپنی بے کسی کی نشانی بھی لئے ہوئے تھی۔ جب تک یہ پیٹ میں تھا۔ میں چاہتی تھی اس کا نشان تک ختم ہو جائے۔ لیکن جب ایک دن ہسپتال کے ایک کمرے میں میرے وجود کی خلوت سے نکل کر میری آغوش میں آگیا تو میری سوئی ہوئی ممتا جاگ اٹھی۔ نفرت کا جذبہ جس کو نو ماہ سے پرورش کر رہی تھی نہ جانے کہاں گیا ——— اس کی معصوم نگاہیں جیسے کہہ رہی تھیں: میں تمہارا خون ہوں میں تمہارے جسم کا ایک حصہ ہوں۔ میں تمہارا سب سے مقدس جذبہ ہوں میں تمہاری تمناؤں اور آرزوؤں کی دنیا ہوں ——— اس کے ننھے ننھے ہاتھ میرے گالوں کو چھونے لگے اور میں اپنے سینے میں برف کی قاش پگھلتی ہوئی محسوس کرنے لگی۔ ایک دن تم اتفاقاً ہسپتال میں پہنچ گئیں۔ تم نے میری کہانی سنی اور پھر ——— میرے بچے کو لے پالک بنا کر اس گھر میں لے آئیں اور میں ایک سکول میں معلمہ بن گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا قصہ ہے مگر اس میں ایک عورت نے اپنے دل کی تمام دھڑکنیں سمو دی ہیں۔ اپنے

بچے کو، اپنے دل کے ٹکڑے کو، کتنے قریب سے دیکھ رہی ہوں لیکن کل میرے اور اس کے درمیان کئی میل حائل ہو جائیں گے۔ یہ فاصلہ بڑھتا جائے گا۔ یہاں تک کہ میں پاکستان کے دوسرے کونے میں چلی جاؤں گی!

صغریٰ: بھابی!

ممتاز: ایک خاندان ڈھاکہ جا رہا ہے۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ اس کے ساتھ ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلی جاؤں۔ کم از کم ایک خطرہ تو دور ہو جائے گا۔ آج رات آخری مرتبہ یہاں آئی ہوں (جیب سے ایک رسٹ واچ نکالتی ہے) یہ گھڑی تمہارے بھائی جان نے مجھے آخری سالگرہ پر دی تھی۔ جب یہ بڑا ہو جائے گا تو اسے دے دینا ـــ اور کچھ بھی نہیں دے سکتی۔

(گھڑی تپائی پہ رکھ دیتی ہے)

صغریٰ: صبح چلی جاؤ گی؟

ممتاز: ہمیشہ کے لئے، یہ میرا اٹل ارادہ ہے۔ بچے کی اس میں بہتری ہے۔

(ممتاز بچے کو گود میں اٹھاتی ہے۔ بچہ رونے لگتا ہے)

ابھی بدن گرم ہے۔

(صغریٰ کوئی جواب نہیں دیتی۔ حسرتناک نظروں سے یہ منظر دیکھنے لگتی ہے۔ ممتاز بچے کو پلنگڑی پر لٹا دیتی ہے)

اچھا خدا حافظ (بچے پر نظر ڈالتی ہے)

غرای : بچے کو خاموش تو کرا جاؤ۔

تاز : مجھے جانے دو۔ کافی دیر ٹھہر چکی ہوں۔ کہیں میرے سینے کا طوفان میری آنکھوں میں نہ آجائے!

(دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے ممتاز گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتی ہے)

یاث : (باہر سے) صُغریٰ

غرای : جی

یاث : دروازہ کیوں بند کر لیا ہے؟

(صُغریٰ ممتاز کو ہاتھ کا اشارہ کرتی ہے جس کا مطلب ہے پرے چلی جاؤ۔ ممتاز کمرے کے اس حصے میں چلی جاتی ہے جو تاریکی میں ہے۔ صُغریٰ دروازہ کھولتی ہے بچہ رو رہا ہے)

یاث : (اندر آکر) بچہ کیوں رو رہا ہے؟

غرای : جاگ پڑا ہے۔

(غیاث دوا تپائی پر رکھ دیتا ہے اور بچے پر جھکتا ہے)

یاث : تم نے اُٹھایا نہیں؟

غرای : میں نے نہیں اُٹھایا (غیاث بچے کو اُٹھا لیتا ہے)

یاث : چمچہ میں ایک پڑیا گھول دو۔

غرای : بہتر

(صغریٰ چمچہ میں مکسچر ڈالتی ہے پھر چمچہ ہلا گھول کر بچے کے منہ میں آہستہ آہستہ انڈیلتی ہے)

مجھے دے دیں اور آپ کمرے میں جا کر آرام کریں۔

غیاث: چپ کرا لوں

صغریٰ: چپ ہو جائے گا۔ لائیے مجھے دیجیے۔

(صغریٰ بچے کو گود میں اٹھا لیتی ہے۔ بچہ خاموش ہو جاتا ہے)

غیاث: تمہارے پاس جا کر خاموش ہو گیا۔

صغریٰ: آپ اسے چپ کرانے کا طریقہ نہیں جانتے۔ اچھا اب آرام کیجیے۔

غیاث: دو دو گھنٹے بعد دوا دینی ہو گی

صغریٰ: دے لوں گی۔

غیاث: اچھا (یکایک تپائی پر رسٹ واچ دیکھ کر) یہ کیا ہے (غیاث رسٹ واچ اٹھا لیتا ہے)

صغریٰ: (گھبرا کر) ایک سہیلی کی ہے۔ یہیں چھوڑ گئی۔

غیاث: (آہ بھر کر) اسی قسم کی گھڑی میں نے ممتاز کو سالگرہ کے موقعہ پہ دی تھی۔

صغریٰ: پرانی باتیں یاد نہ کیجیے بھائی جان! خواہ مخواہ دکھ ہوتا ہے۔

غیاث: صغریٰ! تم جا کر سو رہو۔ میں اب نہیں سو سکوں گا۔ ادھر بھی جا کر جاگنا ہے تو یہیں کیوں نہ بیٹھا رہوں — تم کیوں اپنی نیند حرام کرتی ہو۔

صغریٰ: آپ جا کر لیٹیں تو سہی، نیند آ جائے گی۔

غیاث: تمہیں اصرار ہے تو چلا جاتا ہوں، نیند نہ آئی تو آ جاؤں گا۔ پھر تمہیں جانا

پڑے گا۔

غری: بہتر

(رسٹ واچ کو ایک مرتبہ دیکھتا ہے اور تپائی پر رکھ کر دروازے سے نکلنے لگتا ہے۔ جب وہ دروازے سے نکل جاتا ہے تو ممتاز آتی ہے)

غری: دیکھا بھابی! اس شخص کے متعلق بھی تمہاری وہی رائے ہے جو عام مردوں کے بارے میں ہو سکتی ہے؟

از: مجھے جانا ہی چاہیے — دُور، یہاں سے بہت دُور۔

ری: ذرا ٹھہرو۔ کمرے میں چلے جائیں۔

(ممتاز دو تین لمحے خاموش کھڑی رہتی ہے۔ پھر دروازے کی طرف جاتی ہے۔ غیاث آتا ہے۔ ممتاز ایک طرف ہٹ جاتی ہے غیاث پہ ابھی اس کی نظر نہیں پڑی)

ث: ابھی نہیں آئے گی نیند (ممتاز کو دیکھتا ہے) کون (ایک قدم آگے بڑھ کر) ممتاز!

(ممتاز منہ سے کچھ نہیں کہتی آنکھیں جھکا لیتی ہے)

صغریٰ یہ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں!

ری: بھائی جان! یہ بھابی ہی ہیں۔

ث: تو — تو — یہ ہوا کیا — یہ ہو کیا رہا ہے؟

غری: بھابی! اب تو وہ دیوار خود بخود گر پڑی ہے۔ اس میں میرا کوئی قصور

نہیں۔ میں نے اپنا وعدہ نہیں توڑا۔ اب خاموش نہ رہو۔

غیاث: ممتاز!

(ممتاز خاموش رہتی ہے)

صغریٰ: یہ کچھ نہیں بتائے گی بھائی جان! میں ہی بتاتی ہوں۔ بھابی زندہ سلامت پاکستان میں آ گئی مگر —— بھائی جان! آپ جانتے ہیں۔ اس فساد میں عورت پر جو ظلم ہوئے ہیں، تاریخ اُن کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ بھابی اپنے بچے کو ایک جرم سمجھتی تھی۔ میں یہ بچہ لے پالک بنا کر ہسپتال سے اُٹھا لائی اور آپ سے کہہ دیا کہ اس کے والدین فوت ہو چکے ہیں —— بھابی ایک سکول میں معلّمہ بن گئی اور آپ کی غیر موجودگی میں بچے کو دیکھتی رہی۔ یہ بچہ ممتاز کا ہے —— یہ گھڑی ممتاز کی ہے۔ جو اس نے اپنے بچے کو دی ہے۔ کیونکہ یہ کل ڈھاکہ چلی جائے گی۔

(صغریٰ خاموش ہو جاتی ہے —— ممتاز بچے کو گود میں اُٹھاتی ہے اور چپ چاپ دروازے کی طرف جانے لگتی ہے —— غیاث رسٹ واچ اُٹھا کر آگے بڑھتا ہے)

غیاث: ممتاز! اپنی سالگرہ کا تحفہ تو لے جاؤ۔

(ممتاز رُک جاتی ہے۔ مگر بولتی نہیں)

یہ تمہاری چیز ہے اسے یہاں نہیں رہنا چاہئے اور تم بھی تو مجھے تحفہ دیا کرتی

غیاث: میں تم سے یہ چیز مانگتا ہوں —— یہ بچّہ !

(غیاث بچّہ ممتاز کی گود سے لے کر اپنے سینے سے لگا لیتا ہے)

ممتاز: آپ —— (مسرت و حیرت سے وہ کچھ کہہ نہیں سکتی)

صغریٰ: بھائی جان ! —— (تیزی سے اُن کی طرف بڑھتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

شہنائی

کردار

○ ناہید ---------- ایک اندھی لڑکی

○ جاوید ---------- اس کا محبوب

○ سعیدہ ---------- ناہید کی بہن

○ ڈاکٹر

پہلا منظر

(ایک چھوٹا سا سادہ کمرہ۔ دیواریں ہر قسم کی آرائش سے بے نیاز ہیں۔ صرف ایک دیوار پر کلاک لٹکا ہے اور اس کے نیچے تھوڑے سے فاصلے پر ایک پرانا کیلنڈر نظر آ رہا ہے۔ کلاک والی دیوار میں ایک دروازہ جو شہ نشین میں کھلتا ہے۔ اس دروازے کے بالکل سامنے ایک اور دروازہ ہے۔ جس کی دوسری طرف ہال کمرہ ہے۔ اندر باہر جانے کے لئے یہی دروازہ کام دیتا ہے اس دروازے پر ہلکے نیلے رنگ کا پردہ لہرا رہا ہے۔ ان دروازوں کے علاوہ کلاک والی دیوار میں ایک کھڑکی بھی ہے۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے۔ ہم ناہید کو ایک صوفے میں بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ناہید پچیس سال کی ایک خوبصورت اندھی لڑکی ہے۔ جس کے چہرے کے ابھرے ابھرے نقوش سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر وقت اپنے تصورات میں غرق رہتی ہے۔

شام کی تاریکی کمرے میں پھیل رہی ہے —— ناہید کے سامنے تاریکی گہری ہوتی جا رہی ہے۔

دُور سے شہنائی کی آواز آنے لگتی ہے ——— جیسے جیسے یہ آواز بلند ہوتی جاتی ہے ——— ناہید کا اضطراب بڑھتا جاتا ہے۔ کئی لمحے گزر جاتے ہیں ——— اسی اثنا میں سٹیج پر ناہید کے سوا اور کچھ بھی نظر نہیں آتا ——— یکایک سٹیج کے نیم تاریک حصے سے ایک سایہ بڑھتا ہوا ناہید کی طرف آنے لگتا ہے۔ یہ سایہ ناہید کے پاس پہنچ کر ایک خوبصورت نوجوان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لباس ہلکے نیلے رنگ کا ہے ——— "یہ جاوید" ہے۔ جاوید ایک عجیب ذوق و شوق کے عالم میں ناہید کی طرف دیکھنے لگتا ہے ———

شہنائی کی بہت مدھم آواز بیک گراؤنڈ میں جاری رہتی ہے ——— اور جب تک جاوید سٹیج پر رہتا ہے ——— جاری رہتی ہے۔ ہال کمرے والے دروازے سے روشنی ناہید اور جاوید پر پڑ رہی ہے)

ناہید: (ذرا اضطراب سے کھڑے ہو کر) کون ——— جاوید؟

جاوید: ہاں، ناہید!

ناہید: آ ہی گئے آخر کار۔

جاوید: آخر کار کیوں ———؟ کل بھی تو آیا تھا ——— شام کے وقت یہیں تو تھا۔

ناہید: ضرور یہیں تھے۔ میں نے کب انکار کیا ہے۔ مگر کل اور آج کے درمیان ——— وقت کا یہ مختصر سا حصہ نہ جانے کتنا طویل عرصہ بن گیا تھا۔

جاوید: جب میں آیا تو تم کچھ اُداس تھیں۔

ناہید: تنہا جو تھی۔

جاوید: چھوٹی بہن کہاں ہے؟

ناہید: اپنی ایک سہیلی کے ہاں گئی ہے۔ شادی ہے وہاں۔ نہیں جاتی تھی۔ میں نے مجبور کرکے بھیجا۔

جاوید: کتنی محبت ہے تم دونوں بہنوں میں۔

ناہید: دُنیا میں شاید ہی کسی بہن کو اپنی بہن سے اتنی محبت ہوگی جتنی سعیدہ کو مجھ سے ہے۔ میں اندھی ہوں، بےکس اور مجبور مگر وہ سایے کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ اگر وہ نہ ہوتی تو ماں باپ کے فوت ہونے کے بعد —— میرے لئے زندہ رہنے کا کیا سہارا تھا؟

جاوید: اگر سعیدہ نہ ہوتی تو شاید تم ——

ناہید: یقیناً زندہ رہنے سے انکار کردیتی۔ ہر وقت چاروں طرف پھیلے ہوئے گھرے اندھیرے میں سانس لینا —— یہ بھی کوئی زندگی ہے۔

جاوید: کس وقت واپس آئے گی؟

ناہید: شام کے بعد واپس آجائے گی؟

جاوید: شام کے بعد واپس آئے گی —— شام ہوگئی ہے

ناہید: جاوید! وہ آئے تو تم یہیں رہو۔ میری خوشی سعیدہ کی خوشی ہے۔

جاوید: یہ نہیں ہوسکتا ناہید!

ناہید: سعیدہ کو تمہارے متعلق بتاتی ہوں تو وہ تمہارے وجود سے انکار کر دیتی ہے۔ کہتی ہے باجی! انہیں عجیب قسم کا وہم ہو گیا ہے ---- بھلا یہاں کون آ سکتا ہے ---- کسے یہاں آنے کی ہمت ہے؟

جاوید: وہ جو کچھ سمجھنا چاہتی ہے سمجھنے دو۔

ناہید: یہ درست ہے تاہم اس کی موجودگی میں یہیں رہو تو کیا حرج ہے۔ وہ بہن ہی تو ہے۔

جاوید: وہ مجھے نہیں دیکھ سکتی۔

ناہید: اچھا یونہی سہی۔ تم مخالفت کرو تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ ابھی تک کھڑے کیوں ہو بیٹھ جاؤ نا۔

جاوید: تم بھی بیٹھ جاؤ۔

(دونوں کھڑکی کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں)

ناہید: ستارے نکل آئے ہیں؟

جاوید: ابھی ابھی سورج غروب ہوا ہے۔ فضا کی وسعتوں میں کہیں کہیں ننھے ستارے شبنم کے قطروں کی طرح چمک رہے ہیں۔

ناہید: میں شبنم کے قطروں کو دیکھنے سے محروم ہوں۔ مگر جب باغ میں کسی درخت کی شاخ کو چھوتی ہوں تو میرے دل و دماغ میں ایک قسم کی ٹھنڈک کا احساس ہونے لگتا ہے۔ شبنم کتنی پیاری چیز ہے (ایک دم ٹھٹھک کر) جاوید!

جاوید: کیوں ناہید!

ناہید: جب سعیدہ باتیں کرتی ہے — تو بعض باتیں میں بالکل نہیں سمجھ سکتی — مگر تم جو کچھ کہتے ہو مجھے اپنے دل کی گہرائیوں میں گونجتا ہوا محسوس ہوتا ہے

جاوید: میں ہر وقت تمہارے دل کی گہرائیوں میں جھانکتا رہتا ہوں۔ اس لئے۔

ناہید: ایک اور معمّا بھی ہے۔

جاوید: کیا؟

ناہید: جب تم میرے پاس ہوتے ہو تو مجھے محسوس ہوتا ہے۔ ہم کبھی جدا نہیں ہوئے تھے — مگر جب تم چلے جاتے ہو تو مجھے یقین ہونے لگتا ہے۔ جیسے تم چھوڑ کر کسی دوسری دنیا میں چلے گئے ہو — اور اب کبھی واپس نہ آؤ گے۔

جاوید: حالانکہ میں تم سے کبھی جدا نہیں ہوتا۔

ناہید: آج ہماری ساتویں ملاقات ہے شاید۔

جاوید: ہاں ساتویں۔

ناہید: اور ہم کس قدر بے تکلف ہو گئے ہیں

جاوید: ہم میں تکلف ہو ہی نہیں سکتا۔ تکلف اجنبیت کی علامت ہے اور ہم میں ذرا اجنبیت نہیں۔

ناہید: میرا بھی یہی خیال ہے۔

جاوید: ہم دونوں ایک طرح سوچتے ہیں — ایک ہی قسم کی باتیں کرتے ہیں اور ایک ہی زاویے سے چیزوں کو پرکھتے ہیں اور ہم ایک ہی طرح دیکھتے بھی ہیں

اہید: میری آنکھیں نہیں ہیں —!

جاوید: میں جو کچھ دیکھتا ہوں — وہ تم بھی دیکھتی ہو — اس نیلے آسمان کے نیچے بسنے والی دُنیا میں نہیں بلکہ اس دُنیا میں جو تمہارے دل کے اندر ہے — جو تمہارے سینے کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ جسے تمہارے تصوّرات نے اپنی گود میں آباد کر رکھا ہے — یہی میری دُنیا ہے — یہی تمہاری دُنیا ہے — اگر میری آنکھیں ہیں تو کیا ہوا — اگر تمہاری آنکھیں نہیں تو کیا ہوا —؟ ہم — تم دونوں ایک ہیں — اور ہمیشہ ایک رہیں گے!

اہید: ہم ایک ہیں — یہ الفاظ کتنے میٹھے — کس قدر خوبصورت ہیں —

جاوید: جب تم سے ملاقات نہیں ہوئی تھی تو میری زندگی ایک تنگ و تاریک غار تھی جس کی فضا میں دور سے آتی ہوئی آوازوں کی گونج کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ تم آئے تو ان آوازوں کو زندگی مل گئی — حرارت اور گرمی مل گئی۔ جب میں نے پہلے پہل تمہاری آواز سُنی تو یہ آواز مجھے بالکل آشنا معلوم ہوئی — جیسے یہ آواز مدت سے میری روح میں تیر رہی ہے — مدت سے میرے سینے میں خون کی گردش کے ساتھ دوڑ رہی ہے اور جانتے ہو پھر کیا ہوا؟

جاوید: سب کچھ جانتا ہوں۔

ناہید: یہ آواز سنتے ہی میرے ذہن میں ایک شکل بھی ابھر آئی —— یہ شکل بھی میرے لئے ایک اجنبی شکل نہیں تھی۔

جاوید: اجنبی کیونکر ہو سکتی تھی؟

ناہید: تم شاید یہ سن کر ہنس پڑو گے کہ میں تمہیں کبھی کبھی وہی شہنائی بجانے والا شہزادہ سمجھ لیتی ہوں۔

جاوید: مجھے معلوم ہے۔

ناہید: جب میں بچی تھی تو میری نانی نے مجھے ایک کہانی سنائی تھی —— کسی ظالم دیو نے ایک شہزادی کو ایک غار میں بند کر رکھا تھا۔ ایک شہزادے کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ شہنائی بجانے والے کا بھیس بدل کر وہاں جا پہنچا دیو نے شہنائی کی آواز سنی تو اس قدر خوش ہوا کہ اس نے شہزادے کو اپنے گھر میں نوکر رکھ لیا۔ ایک دن شہزادے نے دیو کی عدم موجودگی میں شہزادی کو اس تنگ و تاریک غار سے باہر نکالا اور لے اپنے وطن لے گیا —— یہ شہنائی بجانے والے شہزادے کی کہانی ہے اور اس کہانی نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔

جاوید: یہ کہانی مجھے بھی معلوم ہے۔

ناہید: ایک بات مجھے پریشان کر دیتی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ شہزادے کا وطن

کہاں تھا۔ آخر ایک دن میں نے اپنی نانی سے پوچھ لیا۔ نانی نے جواب دیا اُفق کے اُس پار ایک خوبصورت ملک ہے۔ شہنائی بجانے والا شہزادہ وہیں رہتا ہے۔ اس کے بعد میں اسی شہزادے کے خیالات میں غرق رہنے لگی۔ تم آئے تو مجھے محسوس ہُوا وہی شہنائی بجانے والے شہزادے ہو اور اُفق کے پار سے آئے ہو۔

(شہنائی کی آواز بلند ہو جاتی ہے ـــ اور پھر دو تین لمحوں کے بعد مدھم ہو جاتی ہے)

ریدہ: میں نہ کبھی اُفق کے پار رہتا تھا ـــ اور نہ وہاں سے آیا ہوں۔

ید: تو پھر کہاں سے آئے ہو؟

ریدہ: میں یہیں تھا ـــ میں یہیں رہوں گا۔

ید: مگر سعیدہ تمہارے وجود کو صرف وہم سمجھتی ہے۔

ریدہ: وہ جو چاہے سمجھے ـــ کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ اب کافی وقت ہو گیا ہے۔ مجھے جانا چاہیے (کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے) شام گہری ہو گئی ہے۔

یدہ: نہیں، ابھی نہیں۔

ریدہ: تمہاری بہن آ رہی ہے ـــ میں اس کے پاؤں کی آہٹ سُن رہا ہوں۔

یدہ: وہ ابھی اپنی سہیلی کے گھر میں ہے۔

ریدہ: نہیں وہ اپنے گھر سے کچھ دُور ہے ـــ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ تمہارے لئے مٹھائی لئے ہوئے آ رہی ہے ـــ اب وہ دروازے پر پہنچ گئی۔

ناہید: وہ دوسرے کمرے سے ضرور آواز دے گی۔

جاوید: اب میں جاتا ہوں۔

ناہید: تو کب آؤ گے؟

جاوید: کل ـــ یہیں ـــ اسی کمرے میں۔

ناہید: جاوید۔

(جاوید اسٹیج کے تاریک حصے میں چلا جاتا ہے، شہنائی کی آواز بند ہو جاتی ہے ادھر سے سعیدہ کی آواز آتی ہے "باجی"! اور اس کے ساتھ کمرے کے اندر قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ کمرے میں کوئی آتا ہوا دکھائی دیتا ہے ایک دو لمحوں کے بعد کمرے کا برقی لیمپ روشن ہو جاتا ہے۔ اب سارے کمرے میں روشنی پھیل ہوتی ہے۔

ناہید صوفے پر پڑی ہے اور سعیدہ پاس کھڑی اس کی طرف مضطربانہ دیکھ رہی ہے۔ سعیدہ انیس سال کی ایک معصوم صورت لڑکی ہے)

سعیدہ: باجی سو گئی تھیں آپ؟

ناہید: نہیں تو۔

سعیدہ: تو کیا کر رہی تھیں ـــ لیجئے مٹھائی کھائیے۔ رشیدہ نے بھیجی ہے آپ کے لئے۔

ناہید: اس وقت تو جی نہیں چاہتا۔

(سعیدہ مٹھائی میز کے اوپر رکھ دیتی ہے)

عیدہ: تو آپ کیا کہہ رہی تھیں ؟

ہید: باتیں کر رہی تھی ۔

عیدہ: کریمن سے —— وہ تو یہاں نہیں ہے ۔

ہید: کریمن سے نہیں ——

عیدہ: تو پھر کس سے ؟

ہید: جاوید سے ۔

عیدہ: پھر وہی وہم باجی! میں نے اس کریمن کمبخت سے کہا بھی تھا کہ آپ کو تنہا نہ چھوڑے ، نہ جانے کہاں دفان ہو گئی تھی ۔

ہید: میں نے جھوٹ نہیں کہا سعیدہ —— ابھی تک اس کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے —— ابھی تک اس کے الفاظ میری روح کو گدگدا رہے ہیں ۔

عیدہ: اس قسم کی باتیں آپ پہلے بھی کہہ چکی ہیں —— یہ سپنا ہے یا وہم ہے ۔

اہید: یہ سپنا یا وہم نہیں ہے ۔

عیدہ: تو پھر کیا ہے ؟

اہید: حقیقت ۔

عیدہ: باجی! اس کمرے میں کون آسکتا تھا ؟ ساتھ والے کمرے میں کریمن موجود رہی ، کوئی آتا تو اسے معلوم نہ ہوتا —— اور شہ نشین پہ کوئی کیونکر پہنچ سکتا ہے ؟

ناہید: میں سچ کہتی ہوں سعیدہ! میں پہلے بھی کئی بار اس سے باتیں کر چکی ہوں۔ آج بھی تمہارے آنے سے پہلے اسی سے باتیں کر رہی تھی۔ تم نہیں مانتیں تو نہ مانو تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے حقیقت بدل نہیں سکتی۔

سعیدہ: تو وہ آیا کدھر سے؟

ناہید: یہ میں نہیں جانتی۔

سعیدہ: باجی! بعض اوقات آپ ایسی باتیں کرتی ہیں کہ سخت حیرت ہونے لگتی ہے

ناہید: جب تم گھر کی طرف آ رہی تھیں تو وہ کھڑکی سے تمہیں دیکھ رہا تھا اس نے بتایا تھا کہ اب تم گھر کے بالکل قریب آگئی ہو —— اب تم دروازے میں داخل ہو رہی ہو —— تم آئیں تو وہ چلا گیا۔

سعیدہ: آخر باجی یہ تو بتائیے! وہ ہے کون؟

ناہید: جاوید

سعیدہ: یہ نام تو پہلے بھی آپ سنا چکی ہیں۔

ناہید: اور کیا بتاؤں: —— اس کی شکل ——؟

سعیدہ: آپ نے اس کی شکل کیونکر دیکھی ہو گی باجی! (آواز میں افسوس اور حسرت کا تاثر) کاش آپ دیکھ سکتیں!

ناہید: سعیدہ! یاد ہے ایک مرتبہ تم مجھے ایک نمائش گاہ میں لے گئی تھیں۔ وہاں تم نے مجھے ایک مجسمہ دکھایا تھا اور کہا تھا یہ ایک مشہور مجسمہ ساز کی تخلیق ہے ——

جب میں نے اس مجسمے کے چہرے پر اپنی انگلیاں پھیری تھیں تو اسکا ایک ایک نقش میرے ذہن میں محفوظ ہونے لگا تھا۔

سعیدہ: ہاں یہ مجسمہ آپ خرید لائی تھیں —— اور صبح شام اسے اپنی بے نور آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کرتی رہتی تھیں —— افسوس یہ مجسمہ گر کر ٹوٹ گیا تھا۔

ناہید: ٹوٹ گیا تھا —— اور جاوید کو میں نہیں دیکھ سکی —— مگر محسوس ہوتا ہے مجسمے کے جو نقوش میرے ذہن میں ثبت تھے۔ ان میں زندگی کی حرارت دوڑنے لگی ہے وہی چہرہ —— بالکل وہی چہرہ۔

سعیدہ: باجی!

ناہید: کیوں؟

سعیدہ: خدا کے لیے اس وہم کو دل سے نکال دیں —— ایسا نہ ہو یہ وہم کہیں بیماری بن جائے —— آپ زندگی کو روگ لگا بیٹھیں۔

ناہید: نہیں ایسا نہیں ہوگا۔

سعیدہ: میں نے کئی بار آپ سے کہا ہے اپنی سہیلیوں سے ملا کریں —— لوگوں سے باتیں کیا کریں لیکن آپ کچھ سنتی ہی نہیں۔ جب دیکھو اس منحوس کمرے میں بند ہیں —— سر جھکائے کچھ سوچ رہی ہیں۔

ناہید: لوگوں کی باتیں سن کر بہت جلد گھبرا جاتی ہوں۔

سعیدہ: آپ باتیں کریں تو سہی —— پہلے ہی سوچ رکھا ہے کہ لوگوں کی باتیں سُن کر گھبرا جائیں گی —— چلئے ذرا ہوا خوری کر چلئے نا۔

ناہید: بہتر!

(سعیدہ بہن کا ہاتھ پکڑ کر دروازے میں سے جانے لگتی ہے۔ دروازے پر پہنچ کر بجلی کا بٹن دبا دیتی ہے۔ سٹیج پر تاریکی پھیل جاتی ہے —— چند لمحے سٹیج پر مکمل تاریکی چھائی رہتی ہے —— کلاک تین بجاتا ہے —— سٹیج پر ایک دم روشنی پھیل جاتی ہے —— یہ خواب گاہ ہے۔ ٹیبل پر برقی لیمپ روشن ہے۔ ناہید سر جھکائے پلنگ پر بیٹھی ہے۔ سعیدہ بہن کی طرف مضطرب نگاہوں سے دیکھ رہی ہے)

سعیدہ: باجی! رات کے تین بج گئے اور آپ جاگ رہی ہیں۔

ناہید: تین بج گئے۔ تم کیوں جاگ اٹھیں؟

سعیدہ: میں سو رہی تھی —— یکایک خیال آیا آپ جاگ رہی ہیں، آنکھ کھل گئی۔ لیمپ جلا کر دیکھا —— واقعی آپ بیٹھی ہیں۔

ناہید: ابھی ابھی جاگی ہوں۔

سعیدہ: کیوں باجی!

ناہید: آنکھ کھل گئی۔

سعیدہ: آپ کچھ سوچ رہی ہیں!

ناہید: میری وجہ سے تمہیں کس قدر تکلیف ہو رہی ہے۔

سعیدہ: مجھے کیا تکلیف ہو گی باجی! سوچتی ہوں آپ کا وہم کہیں بیماری نہ بن جائے۔

ناہید: میں نے عہد کر لیا ہے سعیدہ۔

سعیدہ: کس بات کا عہد۔

ناہید: تم ٹھیک ہی کہتی ہو ——— واقعی جاوید کا آنا ——— اور باتیں کرنا صرف وہم ہے ——— یا سپنا۔

سعیدہ: (آواز میں مسرت کا ارتعاش) باجی!

ناہید: اور میں نے عہد کر لیا ہے کہ اس وہم کو دل سے نکال دوں گی

سعیدہ: بہت اچھا کریں گی۔ باجی آپ!

ناہید: تم جو کہتی رہتی ہو ہر روز ———

سعیدہ: اس لیے کہتی رہتی ہوں کہ آپ خواہ مخواہ اپنے آپ کو روگ لگا رہی ہیں ——— اس منحوس کمرے میں بھی نہ جائیے۔

ناہید: نہیں جاؤں گی ——— اب اس قصے ہی کو چھوڑ دو۔

سعیدہ: بہتر باجی!

ناہید: نیند نہیں آتی۔

سعیدہ: تو باتیں کرتے ہیں۔

ناہید: اس وقت میرا جی چاہتا ہے کوئی کہانی سنوں۔

سعیدہ: کہانی سناؤں ــــ؟ وہی کہانی سناتی ہوں جسے بچپن میں آپ بڑے شوق سے سنا کرتی تھیں۔ شہنائی بجانے والے شہزادے کی کہانی ــــ ایک ویرانے ــــ

ناہید: سعیدہ!

سعیدہ: کیوں باجی؟

(دور سے شہنائی کی
آواز آنے لگتی ہے)

ناہید: یہ کہانی نہ سناؤ ــــ بند کر دو یہ کہانی۔

سعیدہ: اچھا ــــ مگر کیوں ــــ؟

ناہید: کیوں ــــ؟ میں کیا بتاؤں ــــ چلو سو رہیں ــــ نیند آ جائے گی۔

سعیدہ: باجی!

ناہید: آ جائے گی نیند ــــ تم بھی لیٹ جاؤ ــــ بتی بجھا دو۔

(اسٹیج پر پھر تاریکی پھیل جاتی ہے

وہی کمرہ جو پہلے منظر میں دکھایا گیا ہے۔ ناہید اور سعیدہ کھڑکی کے پاس

کھڑی ہیں۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے کھڑکی کے پٹ بار بار ٹکرا رہے ہیں
ناہید اپنی بے نور آنکھوں سے فضا کی تاریک وسعتوں کو گھورنے کی
کوشش کر رہی ہے)

ہید: اُف کس قدر تیز ہوا ہے۔

یدہ: ہاں باجی!

ہید: فضا میں اندھیرا ہوگا ــــ!

یدہ: اندھیرا ہی اندھیرا ہے ــــ افق کے وسیع غاروں سے تاریکی کے گہرے بادل اُمڈے چلے آ رہے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ اس خوفناک تاریکی کے سینے سے کسی چاند، کسی سورج کی روشنی نہیں پھوٹے گی ــــ باجی، دوسرے کمرے میں چلیں!

ہید: تم جاؤ، میں یہیں کھڑی رہوں گی۔

یدہ: آپ نے تو کہا تھا میں کبھی اس کمرے میں نہیں آؤں گی۔

ہید: خود بخود چلی آئی ــــ یہ معلوم ہی نہ ہو سکا میں یہاں پہنچ گئی ہوں۔

یدہ: تو پھر چلو۔

ہید: تھوڑی دیر تک یہیں رہتی ہوں ــــ عجیب کیفیت ہے اس وقت دل کی۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس منجمد یخ بستہ اندھیارے کو اپنی انگلیوں سے چھو رہی ہوں۔ اندھیرے کے کثیف بادل آتے ہیں اور میرے

دل و دماغ کو چھو کر پھر واپس چلے جاتے ہیں۔ مگر افق ہمیشہ تاریک نہیں رہے گا ——— روشنی ضرور پھوٹے گی۔ شاید چند لمحوں کے بعد ——— کچھ دیر کے بعد۔ مجھے آنے والی روشنی کا احساس ہو رہا ہے۔

سعیدہ: مگر باجی! یہاں کھڑکی کے پاس ٹھہریئے نہیں ہوا تیز ہے ——— آپ پہلے ہی کافی کمزور ہیں۔

ناہید: میری فکر نہ کرو سعیدہ! تم جاؤ۔ دیکھو تو کریمن باورچی خانے میں کیا کر رہی ہے آج تم نے رشید کو کھانے پر بلا رکھا ہے (وقفہ) خاموش کیوں ہو گئی ہو؟

سعیدہ: میرا دل بیٹھا جا رہا ہے!

ناہید: وہ کیوں ——— سعیدہ!!

سعیدہ: کوئی خاص بات تو نہیں۔

ناہید: پھر بھی!

سعیدہ: رات میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔

ناہید: خواب؟

سعیدہ: ہاں باجی!

ناہید: کونسا خواب کہو۔

سعیدہ: رات میں نے خواب میں دیکھا کہ سخت آندھی چلی آ رہی ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے جو پیپل کا درخت ہے۔ اس کے پتے شاخوں سے ٹوٹ

ٹوٹ کر گر رہے ہیں یہاں تک کہ ایک شاخ پر صرف دو پتے باقی رہ گئے ہیں ان میں سے بھی ایک پتہ ٹوٹ جاتا ہے — یہ دیکھ کر میں کانپ اٹھی — اور بیدار ہو گئی۔

ناہید: تم تو مجھے وہمی کہا کرتی تھیں — اور اب خود —

سعیدہ: (الفاظ کاٹ کر) مگر باجی! نہ جانے میرا دل صبح سے کیوں بیٹھا جا رہا ہے۔

ناہید: اپنے دل کو قابو میں رکھو — اور جاؤ باورچی خانے میں کھانے کی نگرانی کرو۔

سعیدہ: آپ بھی چلیں باجی! مجھے ڈر ہے کہ آپ پھر وہی خواب نہ دیکھنے لگیں۔ — جاوید —

ناہید: (الفاظ کاٹ کر) میرے جانے کی کیا ضرورت ہے — اور جاوید — میں وعدہ کر چکی ہوں کہ اب کبھی اس بات کا ذکر تک نہیں کروں گی

سعیدہ: میرا بھی آپ سے الگ ہونے کو جی نہیں چاہتا —

ناہید: تم ہمیشہ کے لیے الگ نہیں ہو رہیں۔ میں وہیں آجاؤں گی۔ یونہی گھبرا رہی ہے پاگل!

سعیدہ: آپ آجائیں گی اُدھر؟

ناہید: تم چلو تو سہی۔

سعیدہ: اچھا میں جاتی ہوں —

(سعیدہ کمرے سے نکل جاتی ہے — دور سے شہنائی کی آواز)

ناہید: وہ آرہا ہے — پھر آرہا ہے، مگر میں نہیں ملوں گی — میں نہیں یہاں ٹھہروں گی۔

(شہنائی کی آواز بلند ہو رہی ہے — آندھی کا شور برپا ہے)

نہیں میں اسے دل سے نکال چکی — اب میرے اور اس کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے — وہ ایک خواب تھا جو بھول چکا ہے — ایک واہمہ تھا جو مٹ چکا ہے۔ میں اس کمرے میں نہیں ٹھہروں گی —

(دروازے کی طرف جانے لگتی ہے، جاوید آتا ہے)

جاوید: ناہید!

ناہید: (دروازے پر رُک کر) تم پھر آگئے۔

جاوید: تم نے بلایا، میں آگیا۔

ناہید: میں نے تمہیں نہیں بلایا — میں اب تمہیں نہیں بلا سکتی۔

جاوید: اگر تم نہ بلاتیں تو میں ہرگز نہ آتا۔

ناہید: تو اب چلے جاؤ۔

جاوید: چلا جاؤں — ایک بار اور کہہ دو۔ میں چلا جاؤں گا۔

ناہید: چلے جاؤ — (رُک کر) تمہیں — چلا جانا چاہیے۔

(جاوید ایک طرف ہٹ کر خاموش کھڑا رہتا ہے)

ید: میں چلا جاؤں ——؟

ید: ہاں —— مگر نہیں ذرا ٹھہرو۔ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔

وید: مجھے جانے دو لیکن یہ سن لو۔ تم مجھے اپنی زندگی سے دور نہیں کر سکتیں۔

ید: کوشش کروں گی۔

وید: ہزار کوشش کرو۔ یہ تمہاری طاقت سے باہر ہے —— میں تیرہ سال سے تمہارے تصوّرات کے دھندلکے میں زندگی کی شاہراہ پر تمہارے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا —— ایک دن تم میرا دامن پکڑ کر مجھے اپنی زندگی میں لے آئیں۔ میں آ گیا۔ اب تم چاہتی ہو میں پھر واپس چلا جاؤں —— اگر میں چلا گیا تو تم ایک خزاں زدہ پتّے کی طرح زندگی کی شاخ سے گر پڑو گی ——!

ید: شاخ پر دو ہی پتّے رہ گئے ہیں —— ان میں سے ایک پتّہ ٹوٹ گیا تو اُف میرے اللہ آج کیا ہو گا —— آج کیا ہونے والا ہے۔

وید: ناہید! میں ایک مجسمہ نہیں ہوں۔ جسے توڑ دو گی —— میں اس مجسّمے کی رُوح ہوں —— اور یہ رُوح مجسمہ ساز کی نہیں تمہاری تخلیق ہے —— جو ازل اور ابد سے بے نیاز ہے، جو وقت اور مقام سے ماورا ہے —— جو تمہارے ساتھ ساتھ ہے —— جو تمہارے ساتھ ساتھ رہے گی ——

(طوفان کا شور)

ہید: میں چاہتی تھی کہ تم نہ آؤ —— اب تم آ گئے ہو تو میرے سینے میں ایک

تلاطم برپا ہو گیا ہے۔

جاوید: تو اب بھی کہہ دو ـــــ میں چلا جاؤں۔

(طوفانی اثرات)

ناہید: (خاموش)

جاوید: تم سوچ رہی ہو۔

ناہید: ہاں۔

جاوید: تو میں چلا جاؤں۔

(کسی قدر دور سے سعیدہ کی آواز ـــــ باجی! آئیے نا)

ناہید: میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ تم جا سکتے ہو ـــــ تم چلے جاؤ۔

جاوید: یہ تمہاری غلطی ہے ـــــ میں پھر کبھی نہیں آؤں گا۔

ناہید: میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔

(جاوید پیچھے ہٹتا ہوا سٹیج کے آخری گوشے تک پہنچ جاتا ہے شہنائی کی آواز رک جاتی ہے سعیدہ آتی ہے)

سعیدہ: باجی! ہیں آپ کی آنکھوں میں آنسو۔

ناہید: نہیں تو ـــــ

سعیدہ: اور آپ ابھی تک کھڑکی کے پاس کھڑی ہیں ـــــ اس قدر ٹھنڈی ہوا ہے کہ خدا کی پناہ۔ اُدھر بیٹھیے چل کر۔

ناہید: رشیدہ آئی؟

یدہ: ابھی نہیں آئیں۔ چلئے ادھر کوچ پر بیٹھیں ــ اُف آپ کا ہاتھ گرم ہے

(بہن کا ہاتھ پکڑتی ہے ــــ دونوں کھڑکی سے کچھ دُور کوچ پر بیٹھ جاتی ہیں)

ید: طبیعت کچھ ناساز ہے ــــ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سینے میں ایک خلو سا ہو گیا ہے جیسے روح کے اندر سرد تاریکی جم سی گئی ہے

یدہ: ڈاکٹر کو بلاؤں۔

ید: نہیں معمولی بخار ہے۔

یدہ: آپ لیٹ جائیے۔ میں کریمن کو ڈاکٹر کے ہاں بھیجتی ہوں۔

(سعیدہ کمرے سے نکل جاتی ہے۔ شہنائی کی آواز بیک گراؤنڈ میں جاری ہو جاتی ہے)

ید: (بلند آواز سے) کریمن!

(سعیدہ بھاگتی ہوئی آتی ہے)

یدہ: کیا ہے باجی!

ید: وہ کھڑکی بند کر دو ــــ دروازہ بند کر دو۔ وہ پھر آ رہا ہے ــــ سُنتی ہو یہ شہنائی کی آواز۔

یدہ: کہاں باجی!

(دروازہ بند کر دیتی ہے)

ید: یہ ــــ سنو تو۔ صاف آ رہی ہے

یدہ: یہ واہمہ ہے آپ کا باجی! ــــ

ناہید: یہ آواز میرے کانوں میں کیوں آ رہی ہے — کہاں سے آ رہی ہے — شاید اُفق کے اس پار سے — اس اجنبی دُنیا سے (کھانستی ہے)

سعیدہ: خدا کے لیے باجی! اپنی صحت کا خیال کیجیے۔

ناہید: (کھانستے ہوئے) اوہ — یہ میرا وہم ہے۔ پھر وہی وہم

سعیدہ: اب آرام کیجیے۔

(شہنائی کی آواز رُک جاتی ہے مگر طوفان جاری ہے — ناہید دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے — سعیدہ اور ڈاکٹر دروازے پر کھڑے ہیں)

سعیدہ: ڈاکٹر صاحب! یہ کیا بیماری ہے۔

ڈاکٹر: میں خود نہیں سمجھ سکا — مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بیماری اندر اندر اسے کھائے جا رہی ہے — یہ بیماری عرصے سے ہے۔

سعیدہ: کوئی بیماری تو نہیں تھی — ایک وہم ضرور تھا۔

ڈاکٹر: کونسا وہم؟

سعیدہ: باجی کا خیال ہے۔ ان سے ایک شخص جاوید ملنے کے لیے آیا کرتا ہے۔

ڈاکٹر: خیال، کیا مطلب؟

سعیدہ: دراصل اس جاوید کا مادّی وجود کوئی نہیں ہے۔

ڈاکٹر: تمہیں کیونکر معلوم ہوا؟

سعیدہ: ایک دن میں نے چھپ کر دیکھا — وہ تنہا اس طرح باتیں کر رہی

تھیں جیسے کوئی شخص اُن کے سامنے موجود ہو — اور بار بار جاوید کا نام لیتی تھیں۔

ڈاکٹر: اس وہم سے پہلے اُن کی حالت کیا تھی؟

سعیدہ: ہر وقت چُپ چاپ سر جھکائے کمرے میں بیٹھی رہتی تھیں۔

ڈاکٹر: اور کچھ۔

سعیدہ: میں نے کہا باجی! اس وہم کو دل سے نکال دیں اور انہوں نے وعدہ کرلیا اور — میں نہیں جانتی انہیں کیا ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر: حقیقت صاف ہے، بیٹی! تمہاری بہن نے اپنے مجبوروں سے تنگ آکر اپنے خیالوں کی دُنیا میں کسی جاوید کو بُلا لیا تھا۔ یہ جاوید اس کے تصوّر کی تخلیق تھی اور یہی اُس کی زندگی کا سہارا تھا۔

(دوسرے کمرے سے ناہید کی آواز — "سعیدہ!"
ڈاکٹر اور سعیدہ بھاگ کر اُدھر جاتے ہیں۔ ناہید
پلنگ پر پڑی ہے چہرہ مرجھا چُکا ہے پاس کرین کھڑی ہے)

سعیدہ: باجی!

ناہید: سعیدہ! — مجھے جانا ہی چاہیے۔

سعیدہ: کہاں باجی!

(شہنائی کی آواز بیک گراؤنڈ میں جاری ہو جاتی ہے)

ناہید: اُفق کے اُس پار — جہاں سے شہنائی کی آواز آ رہی ہے — مجھے جانا ہی چاہیئے

سعیدہ: (روتے ہوئے) باجی!

ناہید: مجھے جانا ہی ہوگا ——

(طوفان کا شور اور — شہنائی کی آواز کے ساتھ پردہ گرتا

مادرِ قوم

کردار :

○ کوسم سلطان ..... سلطنتِ عثمانی کی ملکہ
○ شاہ گرکی ..... کوسم سلطان کی خاص خادمہ
○ شاذلی .... کوسم سلطان کی خاص خادمہ
○ طلعت خانم ...... مرحوم وزیرِ اعظم احمد پاشا کی بیوہ
○ سلطان ابراہیم .. کوسم سلطان کا اکلوتا بیٹا
○ مصلح الدین .....
○ قطب الدین .....
} عثمانی حکومت کے دو رکن

منظر

(قسطنطنیہ کے شاہی محل میں دورِ عثمانیہ کی مشہور مدبر اور جلیل القدر ملکہ "کوسم سلطان" کا خاص کمرہ۔

اس وسیع کمرے میں آرائش و زیبائش کا ساز و سامان اس قدر دل فریب ہے کہ معلوم ہوتا ہے محل کے اس گوشے میں اونچی اونچی پُرہیبت دیواروں کے درمیان خوابوں کی ایک فسوں ساز اور تخیل انگیز دُنیا آباد ہے۔ دروازوں پر نہایت قیمتی اور رنگ برنگ کے ریشمی پردے لہرا رہے ہیں۔ فرش پر اعلٰے درجے کا بیش قیمت قالین بچھا ہے۔ جس میں جا بجا شیروں اور عقابوں کی شکلیں نمایاں ہیں۔ ہلکی نیلی چھت ہے۔ تین فانوس لٹک رہے ہیں اور صبح کی ملگجی روشنی میں ان فانوسوں کے رنگین اور دلآویز موتی چمک چمک کر فضا میں ایک عجیب پُرتجمل کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔

اس وقت صبح ہو چکی ہے۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا۔ کوسم سلطان پلنگ پر سو رہی ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ سر کے گرد سبز تکیے پر پڑے ہیں۔ کوسم سلطان کی عمر پنتالیس سال کے لگ بھگ ہے۔ سر کے بالوں میں کہیں کہیں سفیدی آ گئی ہے ماتھا فراخ ہے، رخسار خشک ہیں، محنت شاقہ اور ہر وقت کی سوچ بچار نے

ایک لاغر اور نحیف و نزار عورت بنا دیا ہے۔ ناک لمبی اور ستواں ہے مجموعی لحاظ سے چہرہ بارعب اور اثر انگیز ہے۔ پلنگ سے دُور دروازے کے پاس کرسم سلطان کی سب سے پُرانی اور وفادار خادمہ شاہ کوکو، نگاہیں قالین پر جمائے ربط پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھیر رہی ہے۔ شاہ کوکو اپنی مالکن کی طرح دُبلی پتلی ادھیڑ عمر کی عورت ہے۔

چند لمحے گزر جاتے ہیں۔ دروازے کا پردہ ہٹا کر نازلی آتی ہے متفکرانہ نگاہوں سے کرسم سلطان کی طرف دیکھتی ہے اور پھر خاموشی کے ساتھ شاہ کوکو کی دائیں طرف بیٹھ جاتی ہے۔ نازلی تیس پینتیس سال کی عورت ہے۔ کرسم سلطان کی خادماؤں میں شاہ کوکو کے بعد اس کا نمبر ہے۔ ملکہ کے خاص کمرے میں ان دونوں کے علاوہ اور کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ شاہ کوکو بدستور ربط بجانے میں مصروف ہے۔ کرسم سلطان پہلو بدل کر منہ دیوار کی طرف پھیر لیتی ہے۔ شاہ کوکو اور نازلی ایک دوسری کو دیکھتی ہیں۔ شاہ کوکو ربط سے انگلیاں ہٹا لیتی ہے۔

ازلی : سو گئی ہیں اب تو!

شاہ کوکو: ساری رات بیدار رہ کر ابھی ابھی سوئی ہیں۔

نازلی : (سرگوشی کے انداز میں) آخر حضور ملکہ اس قدر بے چین کیوں ہیں؟

شاہ کوکو: ایک خیال پریشان کر رہا ہے انہیں۔

نازلی : شاید انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ محل میں شہزادے کی مخالفت ہو رہی ہے۔

شاہ کوکو : ابھی مخالفت محل سے دُور ہے۔ ملکہ کے خوف سے محل میں کوئی شخص بھی شہزادے کی مخالفت نہیں کر سکتا۔

نازلی : مجھے یقین ہے ملکہ ضرور شہزادے ہی کے بارے میں بے چین ہیں کیونکہ انہیں ہر لمحہ بیٹے ہی کا خیال رہتا ہے۔ شاید ہی دُنیا میں کسی ماں کو اپنے بیٹے سے اتنی محبت ہو گی جتنی ملکہ کو اپنے لختِ جگر سے ہے۔

شاہ کوکو : اس وقت یہاں بیٹھے بیٹھے آج سے پندرہ سال پہلے کی ایک رات یاد آ رہی ہے۔ اس رات ملکہ آج ہی کی رات کی طرح بے چین تھیں۔

نازلی : بے چینی کی وجہ کیا تھی۔

شاہ کوکو : شہزادہ علیل تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ملکہ سارا دن، ساری رات بیٹے کے پاس بیٹھی رہیں۔ اس وقت نہ تو انہیں کھانے کی فکر تھی اور نہ کسی اور بات کا خیال۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کے جسم سے رُوح نکالی جا رہی ہے۔ واقعی شہزادے کی زندگی سخت خطرے میں تھی!

نازلی : سوائے بیٹے کے ملکہ کا دُنیا میں اور کوئی عزیز نہیں ہے۔

شاہ کوکو : تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے یہاں ایک عجیب واقعہ ہوا ہے۔

نازلی : کیا؟

شاہ کوکو : حضرت ملکہ کو سوئے ہوئے تھوڑی دیر ہی گزری ہو گی کہ ایک دم

ونک اٹھیں۔ میں دوڑ کر ان کے پاس پہنچی۔ پوچھا: "کیا ہے حضورِ ملکہ!"

ر انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ اس طرح بیٹھی رہیں جیسے ان

ے کانوں میں کوئی آواز آ رہی ہے اور وہ اُسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہیں

ں نے جب دوسری مرتبہ پوچھا تو کہنے لگیں "یہ شور کیسا تھا؟"۔

ازلی : رات تو بالکل خاموش اور پُرسکون تھی !

ساہ کوکو: خدا جانے انہوں نے آوازیں کہاں سے سُن لیں۔

ازلی : کوئی بھیانک خواب دیکھا ہوگا۔

شاہ کوکو : ہاں۔ کہتی تھیں میں نے دیکھا برف و باد کے شدید طوفان میں گھری
ہوں اور یہ طوفان لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا ہے، یکایک ایک سیاہ بادل چاروں
طرف چھا جاتا ہے اور مجھے تاریکی میں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

ازلی : عجیب بھیانک خواب تھا۔

شاہ کوکو: رات ملکہ نے کئی بار شہزادے کی طبیعت کے بارے میں پوچھا ہے
حالانکہ شہزادہ بالکل صحت مند اور خوش و خرم ہے۔ نازلی! بیٹے کے
معاملے میں عورت کتنی کمزور ہوتی ہے۔

نازلی : ہماری ملکہ میں یہی ایک کمزوری ہے اور یہ کمزوری ہر ماں میں ہوتی
ہے۔ (گوہر سلطان پہلو بدلتی ہے)

شاہ کوکو: (ہونٹوں پر ایک انگلی رکھ کر) خاموش۔

نازلی : سو رہی ہیں ابھی !

شاہ کوکو : ذرا ٹھہرو یہ کیا آواز ہے ۔

(خاموشی میں ایسی آواز جیسے کچھ دور دروازے پر دستک ہو رہی ہے)

نازلی : دالان والے دروازے پہ شاید دستک ہو رہی ہے ۔

شاہ کوکو : کون آ سکتا ہے اس وقت ؟

(کوسم سلطان پریشان ہو کر آنکھیں کھول کر ادھر اُدھر دیکھتی ہے اور تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ جاتی ہے ۔ نازلی وہیں کھڑی رہتی ہے ۔ شاہ کوکو تیزی سے پلنگ کے پاس پہنچ جاتی ہے)

کوسم سلطان : کیا ہے یہ ؟

شاہ کوکو : دروازے پر شاید دستک ہو رہی ہے ۔

کوسم سلطان : (شاہ کوکو سے) تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو ؟

شاہ کوکو : دیکھتی ہوں جا کر حضور ملکہ !

(اب کے زور سے دستک کی آواز سنائی دیتی ہے ۔ شاہ کوکو پردہ اُٹھا کر دروازے سے نکل جاتی ہے ۔ کوسم سلطان ٹکٹکی باندھ کر دروازے کی طرف دیکھتی رہتی ہے ۔ شاہ کوکو آتی ہے)

کوسم سلطان : کون ہے ؟

شاہ کوکو : وزیرِ اعظم احمد پاشا مرحوم کی بیگم آئی ہیں ۔ شرفِ باریابی چاہتی ہیں ۔

دور قوم

وسم سلطان: مرحوم احمد پاشا کی بیگم۔ بُلا لاؤ۔

دشاہ کو کمرے سے نکل جاتی ہے۔ چند لمحوں کے بعد اس کے ساتھ طلعت خانم آتی ہے۔ طلعت خانم پینتیس سال کی عورت ہے۔ چہرے پر حزن و ملال کے گہرے اثرات چھائے ہوئے ہیں۔ اس وقت وہ سر سے پاؤں تک سیاہ لباس میں ملبوس ہے۔ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی وہ وسط میں پہنچ جاتی ہے۔ پھر کوسم سلطان کا بارعب چہرہ دیکھ کر وہیں رُک جاتی ہے۔ کوسم سلطان پلنگ سے اُٹھ کر پلنگ کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور طلعت خانم کو سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتی ہے۔ طلعت کوسم سلطان کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے)

وسم سلطان: ماتمی لباس پہن کر یہاں آنے سے کیا مقصد ہے تمہارا؟

طلعت خانم: فریاد کرنے آئی ہوں ملکہ!

وسم سلطان: کیا ناانصافی ہوئی ہے تم سے؟ تمہیں معلوم نہیں میں امورِ سلطنت میں حصہ نہیں لیتی۔ جو کچھ کہنا ہے سلطان ابراہیم سے کہو جا کر۔

طلعت خانم: انصاف کرنے والا اگر خود ہی ناانصافی کرے تو پھر فریاد لے کر کہاں جائیں؟

کوسم سلطان (دبدبے سے) کیا مطلب ہے تمہارا؟

طلعت خانم: میں نے یہ کہا ہے کہ حضور ملکہ نے سلطنت کے امور جس شخص کے سپرد کر دیے ہیں اگر وہی ناانصافی اور ظلم کرے تو پھر فریاد لے کر آپ کے پاس نہ آئیں تو کیا کریں؟

کوسم سلطان: طلعت!

طلعت خانم: حضور ملکہ! مجھے بیوہ بنانے والا میرے بچوں کو یتیم بنانے والا آپ کا بیٹا ہے۔

کوسم سلطان: تیرا مطلب ہے، وزیر اعظم احمد پاشا کو سلطان ابراہیم نے قتل کیا ہے؟

طلعت خانم: جی ہاں، شہزادے نے میرے شوہر کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا ہے۔

کوسم سلطان: تجھے غلط فہمی ہوئی ہے طلعت! شہزادہ کبھی ایسا ظلم نہیں کر سکتا۔

طلعت خانم: یہ ایک ماں کا فیصلہ ہے۔ میں سلطنت عثمانیہ کی انصاف پسند ملکہ کا فیصلہ سننے آئی ہوں۔

کوسم سلطان: میں ماں بھی ہوں اور ملکہ بھی، اگر ماں کی محبت انصاف کی آنکھوں کو اندھا نہیں کر سکتی۔ تم نے شہزادے پر دنیا کا سب سے بھیانک الزام لگایا اس کا ثبوت دینا ہوگا تمہیں!

طلعت خانم: آپ اسے الزام سمجھیں یا کچھ اور بہر حال یہ حقیقت ہے۔

کوسم سلطان: سلطان ابراہیم نے تمہارے شوہر کی زندگی کا خاتمہ کر دیا ہے نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا! سلطان ابراہیم نے کوسم سلطان کی چھاتیوں سے زندگی کی حرارت حاصل کی ہے۔ جنت مکان خاقان مرحوم کے سائے میں تربیت پائی ہے۔ تم میرے بیٹے پر الزام لگا کر شاہی خاندان کے غیور خون کی توہین کر

رہی ہو۔ دورِ عثمانیہ کی مقدس روایات کو خاک میں ملا رہی ہو۔ میرا ابراہیم کبھی اتنا بزدل نہیں ہو سکتا کہ کسی شخص سے ڈر کر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دے۔

عت خانم: جب پیار کا بھوت سر پہ سوار ہو تو سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے ملکہ!

م سلطان: پیار کا بھوت؟

عت خانم: شہزادہ بدقسمتی سے ایک عورت کے عشق میں گرفتار تھا اور یہ جرم اس نے اسی کے اشارے پہ کیا ہے!

سم سلطان: کون ہے وہ عورت؟

لعت خانم: ایک رقاصہ، ہما خانم۔

سم سلطان: وہ بھورے بالوں والی ذلیل رقاصہ؟

عت خانم: ہاں شہزادے اور رقاصہ کے درمیان مدت سے تعلقات قائم تھے اور سلطنت میں ہر شخص کو اس بات کا علم تھا۔

وسم سلطان: میں نے آج تک شہزادے کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں سنی!

لعت خانم: سلطنت کے ذمے دار ارکان سمجھتے تھے کہ شہزادہ سنبھل جائیگا اس لیے یہ منحوس خبر سنا کر ملکہ کا دل نہ دکھایا جائے۔ میرے شوہر نے شاہی خاندان کا پرانا وفادار ہونے کی حیثیت سے شہزادے کو رقاصہ کے چنگل سے نکالنے کی انتہائی کوشش کی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رقاصہ ان کی مخالفت پر اتر

آئی۔ اس نے اپنی زہر آلود باتوں سے شہزادے کو اس قدر متاثر کر دیا کہ ایک دن شہزادے نے جوشِ غضب میں ان کے قتل کا حکم دے دیا۔

(کوسم سلطان ٹکٹکی باندھ کر طلعت خانم کی طرف دیکھ رہی ہے۔ محل کے نیچے شور بلند ہوتا ہے۔ کوسم سلطان کھڑکی سے باہر دیکھتی ہے۔ یک لخت شور تھم جاتا ہے۔ کوسم سلطان کھڑکی سے ہٹ کر شاہی نوکر کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ باہر جا کر دیکھے یہ کیسا شور ہے۔ سلطان ابراہیم آتا ہے۔ سلطان ابراہیم پچیس سال کا وجیہ جوان ہے۔ اس وقت اس کا رنگ پیلا پڑ گیا ہے)

کوسم سلطان: کیا ہے میرے بیٹے!

سلطان ابراہیم: اماں جان! چند سرپھرے لوگوں نے میرے خلاف سازش پھیلا دی ہے

کوسم سلطان: (گھبرا کر) سازش! سلطنتِ عثمانیہ میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جو میرے بیٹے کے خلاف سازش کر سکے؟

سلطان ابراہیم: اماں جان! لوگ مجھ پر حملہ کرنے کی نیت سے آتے ہیں۔

کوسم سلطان: (نازلی سے) ہجوم کے لیڈروں کو فوراً بلا کر لاؤ۔

(نازلی کمرے سے نکل جاتی ہے۔ شور پھر برپا ہوتا ہے۔ ملکہ جوشِ غم و غصہ میں ٹہلنے لگتی ہے۔ قطب الدین اور مصلح الدین آتے ہیں۔ مصلح الدین آغا بوڑھا آدمی ہے۔ جسم توانا اور مضبوط ہے۔ چہرا بڑا بارعب ہے۔ قطب الدین بھی مضبوط ڈیل ڈول کا آدمی ہے۔ اس کی سفید داڑھی سینے پر بکھری ہوئی ہے۔

(دونوں دروازے سے نکل کر سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے ہیں)

سم سلطان: اس ہنگامے کا مطلب کیا ہے؟

(کوسم سلطان یہ الفاظ کہتے ہوئے شیرنی کی طرح غضب ناک نگاہوں سے دونوں کو دیکھنے لگتی ہے۔)

طبُ الدین: (سینے پر ہاتھ رکھ کر) ہمیں اس کا بڑا افسوس ہے کہ قوم نے جوشِ غضب میں آکر شاہی محل پر حملہ کر دیا ہے۔

وسم سلطان: میری زندگی میں یہ جرأت، یہ دلیری؟

صلح الدین آغا: ملک غم و غصہ سے دیوانہ ہو گیا ہے، ملکہ عالی!

وسم سلطان: تم آج اپنی حقیقت بھول گئے ہو۔ تمہیں معلوم ہے۔ تم کیا تھے اور ہم نے تمہیں کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ تم دونوں کو پیٹ بھرنے کے لیے روٹی بھی میسّر نہیں تھی۔

قطبُ الدین: (مؤدبانہ سر جھکا کر) ہمیں سب کچھ معلوم ہے ہمارے جسموں کا ایک ایک ذرہ شاہی خاندان کے احسانات کے نیچے دبا ہوا ہے۔

کوسم سلطان: اور آج ان احسانات کا بدلہ اس طرح اتار رہے ہو کہ میری زندگی میں وحشی ہجوم کو ساتھ لے کر میرے لختِ جگر کو قتل کرنے کے لیے آگئے ہو۔

قطبُ الدین: (جرأت سے) ہم اپنی محترم ملکہ کے اکلوتے بیٹے سلطان ابراہیم کو گرفتار کرنے نہیں آئے۔ ہم اس سلطان ابراہیم کو کیفرِ کردار تک پہنچانے آئے

ہیں جس نے ہمارے ہر دل عزیز وزیرِ اعظم کو انتہائی سفاکی سے قتل کر دیا ہے

مصلح الدین آغا: اور اگر ہماری ملکہ نے ماں بن کر مجرم کو اپنے دامن میں پناہ دے دی ہے تو ہم واپس چلے جاتے ہیں۔ اپنی ملکہ کے حکم آگے ہمیں چون و چرا کی مجال نہیں ہے۔

قطب الدین: اگر سلطنتِ عثمانیہ کی ماں صرف سلطان ابراہیم کی ماں ہے تو ہمارے پاس کہنے کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔ مقتول احمد پاشا کی بیوی صبر کرے گی۔ مرحوم احمد پاشا کے یتیم بچے اپنے آنسو خشک کر لیں گے۔

مصلح الدین آغا: ملکہ! ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم عوام تک آپ کے الفاظ پہنچا دیں۔ یقین رکھیے کچھ دیر کے بعد محل کے ارد گرد آپ کو ایک شخص بھی نظر نہیں آئے گا!

(اس دوران میں کوسم سلطان ٹکٹکی باندھ کر مصلح الدین آغا اور قطب الدین کو دیکھتی رہتی ہے۔ وہاں سے اس کی نظریں بیٹے پر جم جاتی ہیں۔ جس کے چہرے پر اب زردی کی بجائے سرخی آ گئی ہے۔ قطب الدین اور اس کے ساتھی خاموش کھڑے ہیں)

کوسم سلطان: قانون اپنے ہاتھ میں لے کر شاہی محل پر حملہ کر دینا کوئی معمولی جرم نہیں ہے

قطب الدین: میں عرض کر چکا ہوں غم و غصہ سے ہم لوگ دیوانے ہو گئے تھے ہمیں اپنے اس جرم کا اعتراف ہے۔

(قطب الدین اور مصلح الدین دروازے کی طرف جانے لگتے ہیں)

م سلطان: ٹھہرو کیا مقصد لے کر آئے تھے تم یہاں؟

ب الدین: قوم اپنا مجرم مانگتی ہے۔

م سلطان: جوشِ غضب میں محل پہ حملہ کر دینا ایک بہت بڑا جرم ہے تمہیں ثابت کرنا ہوگا کہ تمہارا غم و غصہ بجا تھا (شہزادے سے) میرے بیٹے! قوم تم پر الزام لگا رہی ہے کہ تم نے وزیرِ اعظم احمد پاشا کو ایک رقاصہ کے اشارے پر قتل کر دیا ہے۔

ان ابراہیم: (خود اعتمادی کے ساتھ) اماں جان اس مردود نے میری سخت توہین کی تھی۔

م سلطان: (جس کے لہجے میں اب گونج اور غصہ ہے) تم اپنے جرم کا اقرار کرتے ہو؟

ان ابراہیم: (کانپ کر) اماں جان!

م سلطان: جرم ثابت ہو گیا ہے (قطب الدین اور مصلح الدین آغا سے) لے جاؤ مجرم کو یہاں سے —— لے جاؤ۔

(سب حاضرین پر سنسنی سی چھا جاتی ہے)

سنا نہیں تم نے قطب الدین! مجرم نے جرم کا اقرار کر لیا ہے۔ لے جاؤ اسے اور وہی سزا دو جو ایک قاتل کو دینی چاہیے۔

ب الدین: ملکۂ عالی!

م سلطان: میں کوئی لفظ سننا نہیں چاہتی۔ لے جاؤ اسے —— لے جاؤ!

(کوسم سلطان بپھری ہوئی شیرنی کی طرح بیٹے کی طرف بڑھتی ہے۔ اس کا گریبان پکڑ کر دروازے کی طرف لاتی ہے اور دھکا دے کر اسے باہر نکال دیتی ہے باہر سے "مادرِ قوم زندہ باد" کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔

کوسم سلطان نڈھال ہو کر دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ شاہ کوکو بھاگی ہوئی آتی ہے)

شاہ کوکو: ملکہ ہجوم سلطان ابراہیم پر ٹوٹ پڑا ہے شہزادہ —— آپ کا بیٹا قتل ہو رہا ہے —— ملکہ! بیٹے کو بچائیے —— اس بیٹے کو بچائیے جس کے بغیر آپ زندہ نہیں رہیں گی۔ جس کے بغیر آپ زندہ نہیں رہ سکیں گی۔

کوسم سلطان: (باوقار لہجے میں) شاہ کوکو! کھڑکی بند کر دو۔ اس وقت کمرے سے چلی جاؤ۔ ہمیں تنہائی چاہیے —— جاؤ!

(شاہ کوکو کھڑکی بند کرنے لگتی ہے۔ کھڑکی بند کر کے وہ رکتی ہے۔ پھر چپ چاپ باہر نکل جاتی ہے۔ کوسم سلطان لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلتی ہوئی پلنگ تک پہنچتی ہے اور بس پہ دھم سے گر پڑتی ہے۔ باہر ہجوم کا شور برپا ہے —— "مادرِ قوم زندہ باد"! —— کوسم سلطان زندہ باد! ——)

نند کمار

کردار:

○ بارول ....
○ فرانسس ....
○ مانسن ....
○ کلیورنگ ....

کونسل کے ارکان

Day

○ وارن ہیسٹنگز .... ہندوستان کا گورنر جنرل
○ لیڈی وارن ہیسٹنگز ... گورنر جنرل کی جرمن نژاد بیوی
○ سر الیجا امپے عدالتِ عالیہ کا چیف جسٹس
○ موہن پرشاد کلکتے کا ایک جوہری
○ نند کمار

زمانہ: ۱۷۷۵ء مقام: کلکتہ

پہلا منظر

علی پور کلکتہ میں ایک شاندار بنگلے "بلویڈیر" کا کونسل ہال

یہ کمرہ اعلیٰ درجے کے سامانِ آرائش سے مزین ہے۔ چھت سے تین نہایت خوبصورت اور بیش قیمت فانوس لٹک رہے ہیں۔ یہ فانوس کچھ عرصہ پیشتر مرحوم نواب سراج الدولہ کے محل کی زینت تھے۔ نواب کے خاتمے پر جب کمپنی کے اربابِ بست و کشاد نے اس کے محل میں لوٹ مار مچائی تھی، تو جو چیزیں انہیں خاص طور پر بہت پسند آگئی تھیں، وہ انہوں نے ولایت بھجوا دی تھیں اور باقی سامان اپنے ہندوستانی بنگلوں اور سرکاری دفاتر میں منتقل کر دیا تھا۔ ان فانوسوں اور فرش پر بچھے ہوئے بیش بہا کشمیری قالین کے علاوہ اور بھی کافی سامان گورنر کے حصے میں آیا تھا جس سے "بلویڈیر" کے مختلف کمروں کی زینت بڑھائی گئی تھی۔

دیواروں پر مغلیہ اور چینی آرٹ کے نادر نمونے آویزاں ہیں۔ یہ چیزیں کمپنی کے اہلکار گورنر کی خاص مراعات حاصل کرنے کی خاطر ان کی خدمت میں وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہے ہیں۔

اس وقت دن کا دوسرا پہر ہے۔ کمرے کے وسط میں ہاتھی دانت کی بنی ہوئی میز کے ارد گرد گورنر جنرل کی کونسل کے چاروں ارکان بیٹھے ہیں ——

دائیں طرف "فرانسس" ہے اور کونے میں "کرنل مانسن" اسی طرح دوسری جانب
جنرل کلیورنگ" ہے اور کونے میں فرانسس کے بالمقابل "بارول" بیٹھا ہے
ایک طرف کونسل کے صدر اور ہندوستان میں برطانوی مقبوضات کے گورنر جنرل
وارن ہیسٹنگز کی کرسی خالی پڑی ہے!

ان میں سب سے کم عمر فرانسس ہے۔ جس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ
ہوگی۔ باقی تینوں ارکان کی عمر چالیس اور پچاس کے درمیان ہے۔ چاروں اپنے
قومی لباس کوٹ پتلون میں ملبوس ہیں۔

فرانسس کے سامنے میز پر کچھ کاغذات پڑے ہیں۔ جن پر وہ نگاہیں جمائے
کچھ سوچ رہا ہے۔ بارول ذرا کرسی کھسکا کر فرانسس کی طرف دیکھتا ہے
فرانسس کی توجہ بھی کاغذوں سے ہٹ کر اس کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔

رول: میں سمجھتا ہوں یہ معاملہ نہایت اہم ہے۔ ہمیں ہر ممکن احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

رانسس: (ذرا مسکرا کر) مسٹر بارول! یہ فقرہ آپ کم از کم چار مرتبہ کہہ چکے ہیں

بارول: معاملہ اس درجہ اہم ہے کہ میں بار بار یہ فقرہ کہنے پر مجبور ہوں۔

انسن: احتیاط سے کام لیے بغیر ہم اس معاملے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔

فرانسس: (کاغذ اٹھا کر اور انہیں دوبارہ میز پر رکھتے ہوئے) کیا اس شہادت کے
باوجود کسی فیصلے پر پہنچنا مشکل ہے؟

بارول: اس کے باوجود۔

فرانسس: اس سے زیادہ بھی کسی وضاحت کی ضرورت ہے؟ مسٹر بارول! آپ ان خطوں کو صحیح تسلیم نہیں کرتے؟

بارول: میں ایک لمحے کے لیے بھی ان پر اعتبار نہیں کر سکتا، وجہ ظاہر ہے

کلیورنگ: وجہ کیا ہے؟

بارول: کیا مجھے پھر وہی فقرے دہرانے پڑیں گے جنہیں میں کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں

کلیورنگ: کیا حرج ہے، زیادہ وضاحت ہو جائے گی۔

بارول: اتنی بات تو صاف ظاہر ہے کہ گورنر جنرل نے اس بنگالی برہمن نند کمار کی دیدہ دلیری کی پوری بندش کی تھی یعنی نند کمار چاہتا تھا کہ رضا خاں کی بجائے وہ دوبارہ بنگالے کا صوبہ دار بن جائے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ گورنر جنرل نے ریگولیٹنگ ایکٹ کے ماتحت صوبوں کے دیوانی اختیارات اپنے قبضے میں لے لیے یعنی نند کمار جو عہدہ چاہتا تھا وہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا ہے۔ کیا اب یہ بھی کہنے کی ضرورت ہے کہ نند کمار نے گورنر جنرل پر رشوت ستانی کا جو الزام لگایا ہے وہ ایک انتقامی کارروائی کے سوا اور کچھ بھی نہیں؟

مانسن: لیکن یہ خط؟

بارول: میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ مجھے ان خطوں پر کوئی اعتبار نہیں، یہ جعلی ہیں!

فرانسس: ذرا سی کے بارے یہ دلیلیں کہنی رکھتے ہوئے، دوستو! میں مانتا ہوں یہ معاملہ بہت اہم ہے اور ہمیں ہر ممکن احتیاط سے کام لینا چاہیے مگر میرے

دوست بارول کو یہ خیال دماغ سے نکال دینا چاہئے کہ وہ چونکہ ہندوستان میں مسٹر ہیسٹنگز کے دستِ راست رہ چکے ہیں۔ اس لیے انہیں گورنر جنرل کی ہر معاملے میں حمایت کرنی چاہئیے اور ہم چونکہ ابھی ابھی انگلینڈ سے آئے ہیں اس لیے ہم ان کی ہر طرح مخالفت کریں گے۔ ہمیں حالات کو بہتر اور خوشگوار بنانا ہے۔ ہمیں گورنر جنرل کو ہر معاملے میں نیک مشورہ دینا ہے۔

رول: میں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوں!

رانسس: سوال یہ ہے کہ نندکمار کو گورنر جنرل پر الزام لگانے کی جرأت کیوں کر ہوئی؟ کوئی شخص بھی اتنی بڑی شخصیت پر جھوٹا الزام لگانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

ارول: بہتر یہ ہے کہ واقعات کو اُن کے حقیقی تسلسل کے ساتھ سمجھا جائے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ اگر نندکمار کو بنگالے کا صوبہ دار بنا دیا جاتا تو معاملہ یہیں ختم ہو جاتا۔ اور اسے مسٹر ہیسٹنگز پر الزام لگانے کی قطعاً ضرورت نہ پڑتی۔ چونکہ اس کا مقصد پورا نہیں ہو سکا۔ اس لیے گورنر جنرل کو بدنام کرنے کے لیے اس نے یہ الزام لگا دیا ہے۔ یہ ہندوستانی — اسی قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں

رانسس: مسٹر بارول! آپ کو اپنی پوزیشن کا خیال رکھنا چاہئے۔

ارول: میں بالکل درست کہتا ہوں۔

رانسس: آپ کو ایسی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے!

ارول: حقیقت بیان کرنا کوئی جرم نہیں ہے!

فرانسس: ناجائز حمایت یقیناً ایک جرم ہے۔

کلیورنگ: حضرات! اس معاملے کو چھوڑیے۔ میں بارول سے پوچھتا ہوں انہوں نے ان خطوں کو پڑھا بھی ہے؟

بارول: پڑھ چکا ہوں اور تین مرتبہ پڑھ چکا ہوں!

مانسن: بارول کو سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ خط نندکمار نے بھیجے ہیں۔ اگر نندکمار کی بجائے یہ خط کسی اور شخص نے بھیجے ہوتے تو شاید اعتراض نہ ہوتا۔ کیوں بارول!

بارول: ہمیں ہندوستانیوں کی فطرت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے اور اس چیز کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ کمپنی اور گورنر جنرل کا اس ملک میں کیا مقصد ہے۔

فرانسس: کاش بارول کو معلوم ہوتا کہ اس وقت انگلستان میں ان کا محبوب گورنر جنرل کس درجہ بدنام ہو گیا ہے۔

بارول: سب کچھ فضول — وارن ہیسٹنگز اس عہد کا ہیرو ہے۔ گریٹ مین!

کلیورنگ: آپ لوگ کن چیزوں میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ اصل معاملے پر غور کیجیے مسٹر بارول! آپ یہ بات بھول گئے ہیں کہ ہمارے پاس صرف نندکمار ہی کی نہیں۔ منی بیگم کی تحریر بھی ہے اگر نندکمار کے خط کو یہ سمجھ کر نظر انداز

کر دیا جائے کہ یہ محض انتقامی کارروائی ہے تو منّی بیگم کی تحریر کو کیا سمجھنا چاہیے؟

فرانسس: (طنزاً) شاید یہ تحریر جعلی ہے؟

بارول: میں اس تحریر کو جعلی سمجھتا ہوں یا نہیں، یہ الگ بات ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ ہم ہندوستان کے گورنر جنرل کو ان بیہودہ معاملات میں گھسیٹ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ ہندوستانیوں کے لگائے ہوئے الزام پر غور کرتے وقت ہمیں یہ بات ہرگز فراموش نہ کرنی چاہیے کہ وارن ہیسٹنگز ہندوستان کا گورنر جنرل ہے — اس کونسل کا صدر ہے — انگلستان کے وقار کا نمائندہ ہے (جوش میں کھڑے ہو کر) ہندوستانی لوگ آپس میں لڑتے رہتے ہیں — ایک دوسرے پر حملہ کرنا ان کی فطرت بن چکی ہے۔ اس لیے ہمیں بڑے ٹھنڈے دل سے اس معاملے پر غور کرنا چاہیے۔ ہماری مخالفت سے ہمارے اپنے وقار کو نقصان پہنچے گا۔ ہمارے اپنے مقاصد کو نقصان پہنچے گا — جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں اس کی راہ میں رکاوٹیں حائل ہو جائیں گی۔ کیا میرے دوست اس امر سے ناواقف ہیں کہ اگر آج ہم اپنی مجوزہ پالیسی پر سختی کے ساتھ عمل نہ کر سکے تو ہندوستان کے بہت سے راجے اور نواب اور خود مغل بادشاہ اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر لیں گے۔ اس طرح ہماری کوششیں خاک میں مل جائیں گی۔ میری رائے یہ ہے کہ ان کاغذوں کو پھاڑ کر پھینک دینا چاہیے اور نند کمار جیسے فریب کار شخص کی کسی طرح بھی ہمت افزائی نہیں کرنی چاہیے۔

فرانسس: اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر گورنر جنرل ہندوستانیوں سے رشوت لے کر انگلستان کے وقار کو خاک میں ملا دے تو ہمیں خاموش رہنا چاہیے۔ بات کچھ معقول ہی معلوم ہوتی ہے۔ (طنزاً) ہندوستان میں بے شمار دولت موجود ہے اگر گورنر جنرل چند لاکھ یا چند کروڑ روپیہ بطور رشوت کے لے لیتا ہے۔ تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

مانسن: اگر گورنر جنرل یہ روپیہ کمپنی کے حوالے کر دے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

بارول: (مسکرا کر) بلکہ بہتر یہ ہے کہ وہ آپ کے حوالے کر دے۔

فرانسس: (میز پر مکا مار کر) مسٹر بارول! آپ نے تسلیم کر لیا ہے کہ گورنر جنرل نے رشوت لی ہے!

بارول: ہرگز نہیں!

کلیورنگ: ابھی تو آپ نے کہا ہے کہ گورنر جنرل رشوت کا روپیہ مانسن کے حوالے کر دے۔

بارول: وہ تو محض ایک مذاق تھا۔

فرانسس: خیر مذاق مذاق ہی ہیں آپ نے حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے اور ——

(فرانسس ابھی اپنا فقرہ مکمل کرنے نہیں پاتا کہ گورنر جنرل کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ وارن ہیسٹنگز کو آتے دیکھ کر کونسل کے سب ارکان تعظیماً کھڑے ہو جاتے ہیں وارن ہیسٹنگز مسکراتا ہے اور جلدی جلدی قدم اٹھا کر فرانسس اور کلیورنگ کے درمیان

اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ وارن ہیسٹنگز چھریرے بدن کا آدمی ہے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی مگر نہایت تیز، جو فی الفور مخاطب کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں ستواں ناک، کشادہ پیشانی، دہانہ تنگ، چہرے سے بلا کی ذہانت نمایاں ہے۔ ارکان اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

رن ہیسٹنگز: معلوم ہوتا ہے۔ کونسل کسی اہم معاملے پر غور کرنا چاہتی ہے!

رول: ہمارے دوست اس وقت ایک خاص غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ گورنر جنرل نے نند کمار کے قول کے مطابق رضا خاں، منّی بیگم اور شتاب رائے سے رشوت میں روپیہ حاصل کیا ہے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ نند کمار نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ محض انتقام کی خاطر کیا ہے۔

(وارن ہیسٹنگز کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے غصے
کی سرخی آتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔)

اسس: گورنر جنرل اس معاملے میں کیا کہتے ہیں!

رن ہیسٹنگز: (صبر و تحمل سے) مسٹر بارول نے جو کچھ کہا ہے درست ہے۔

انسس: تو گورنر جنرل اس الزام کو غلط سمجھتے ہیں؟

رن ہیسٹنگز: (لہجے میں تلخی اور تحکم) کیا کونسل آج اسی موضوع پر گفتگو کرنا چاہتی ہے؟

انسس: معاملے کو صاف کرنا کونسل کا فرض ہے۔ اس الزام سے تاج برطانیہ بدنام ہوتا ہے۔

وارن ہیسٹنگز: یہ الزام غلط ہے۔ اس نیچ برہمن نے انتقام لیا ہے۔

فرانسس: (کاغذوں کو ہاتھ میں لے کر) اور یہ منی بیگم کا خط

وارن ہیسٹنگز: (تحکم) میں کہتا ہوں یہ سب کچھ بکواس ہے۔

کلیورنگ: گورنر جنرل یقیناً محسوس کریں گے کہ اس طرح معاملہ صاف نہیں ہو سکتا۔

بارول: وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔

وارن ہیسٹنگز: اس موضوع کو ختم کیجئے کوئی اور معاملہ چھیڑیئے۔

مانسن: میں گورنر جنرل کی خدمت میں درخواست کروں گا کہ وہ سب سے پہلے اس معاملے کو ختم کریں۔

وارن ہیسٹنگز: تو میں اس معاملے کو ختم کرتا ہوں۔ اس پہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے

فرانسس: کونسل یہ بات سمجھ نہیں سکی۔

وارن ہیسٹنگز: (ملائم لہجے میں) دوستو! آپ کو انگلستان سے آئے ہوئے بہت کم عرصہ ہوا ہے۔ میں گورنر اور گورنر جنرل بننے سے پہلے بھی اس ملک میں رہ چکا ہوں مجھے ان لوگوں کی فطرت کا بخوبی علم ہے۔ ایک دوسرے پہ الزام لگانا ان کے کردار کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔ ہمیں ان باتوں پہ وقت نہیں ضائع کرنا چاہیئے اور وہ کام کرنا چاہئے جس کے لیے ہماری حکومت نے ہمیں یہاں بھیجا ہے

فرانسس: یہ درست ہے مگر ہمیں حالات کو خوشگوار بنانا ہے۔ کمپنی ہندوستان میں اور انگلستان میں دونوں جگہ بدنام ہو گئی ہے!

وارن ہیسٹنگز: یہ غلط ہے۔

فرانسس: اور بدنامی کی وجہ یہ ہے کہ ہماری حکومت کے نمائندے اس ملک میں احتیاط سے کام نہیں لے رہے۔

وارن ہیسٹنگز: (غصے سے) تم نے اس کم بخت برہمن کی باتوں پر اعتبار کر لیا ہے؟

فرانسس: اس نے اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے جو ثبوت بہم پہنچایا ہے وہ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

کلیورنگ: کونسل نے نند کمار کو بھی بلایا ہے۔ آ ہی رہا ہو گا۔

وارن ہیسٹنگز: (غصے سے کھڑے ہو کر) گویا ایک ذلیل شخص کو میرے مقابلے میں لا کر کونسل میری توہین کرنا چاہتی ہے؟

فرانسس: اس سے توہین کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ کونسل چاہتی ہے کہ گورنر جنرل اور نند کمار جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے کہیں۔

وارن ہیسٹنگز: اس سے بڑھ کر میری اور کیا توہین ہو سکتی ہے؟

بارول: واقعی یہ گورنر جنرل کی توہین ہے۔ انگلستان کی توہین ہے۔ تاج برطانیہ کی توہین ہے۔ کونسل اس بات کی مجاز نہیں ہے کہ گورنر جنرل کی موجودگی میں نند کمار کو طلب کرے۔

کلیورنگ: نند کمار کو اس لیے طلب کیا گیا ہے کہ گورنر جنرل کی موجودگی میں جو کچھ

کرنا چاہتا ہے کیسے۔ اس کے بعد کونسل فیصلہ کرے گی کہ یہ صرف ہسٹنگز کی انتقامی کارروائی ہے یا اس میں کچھ صداقت بھی ہے۔ کونسل کو اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس ہے اگر یہ الزام غلط ثابت ہوا تو نند کمار ہماری گرفت سے بچ کر نہیں جا سکے گا۔ مگر ہمیں انصاف کا تقاضا پورا کرنا پڑے گا۔

فرانسس: کونسل گورنر جنرل سے یہ پوچھتی ہے کہ انہیں نند کمار کی موجودگی میں حقیقت بیان کرنے سے کیوں انکار ہے؟

بارول: صاف ظاہر ہے یہ تاج برطانیہ کے سب سے بڑے نمائندے کی توہین ہے

وارن ہیسٹنگز: میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کونسل کو اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ وہ بیہودہ اور فضول باتوں میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرے۔

فرانسس: کونسل کو بہر صورت اپنا فرض پورا کرنا ہوگا!

بارول: یہ فرض شناسی نہیں ہٹ دھرمی ہوگی؟

وارن ہیسٹنگز: میں بحیثیت صدر کے کونسل کو برخاست کرتا ہوں۔

(وقفہ)

فرانسس: اگر گورنر جنرل کونسل سے الگ ہو جانا چاہتے ہیں تو یہ الگ بات ہے کونسل نے اپنے ذمے جو کام لیا ہے اُسے ضرور پورا کرے گی۔

وارن ہیسٹنگز: مجھے معلوم نہ تھا کونسل کے ارکان اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے کے لیے ہندوستان میں آئے ہیں۔ میں اس بات کا اعلان کر دینا اپنا فرض سمجھتا

ہوں کہ از روئے قانون میں کونسل کو برخاست کر سکتا ہوں ـــــ اگر کونسل میری عدم موجودگی میں جاری رہی تو اس کا کوئی فیصلہ میرے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگا!

(کرسی سے الگ ہو کر جانے لگتا ہے)

ول : مجھے بھی گورنر جنرل سے اتفاق ہے (جانے لگتا ہے)

سس : ہمیں اس کی توقع نہیں تھی!

(گورنر جنرل چلا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے بارول بھی رخصت ہو جاتا ہے)

ن : اب کیا کرنا چاہیئے۔

سس : کارروائی جاری رکھنی چاہیے۔ میں تجویز کرتا ہوں۔ موجودہ اجلاس کی صدارت مسٹر کلیورنگ انجام دیں!

ن : مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کیا مسٹر کلیورنگ صدارت کے فرائض انجام دیں گے؟

ورنگ : یقیناً ـــــ ویسے تو اب معاملے نے بڑی نازک صورت اختیار کر لی ہے گورنر جنرل اس بات کو پسند ہی نہیں کرتے کہ رشوت ستانی کے معاملے میں اُن سے بازپرس کی جائے!

سس : یہی چیز اس بات کا ثبوت ہے کہ ہیسٹنگز کے دل میں کھوٹ ہے اگر انہوں نے رشوت نہیں لی تو نند کمار کے سامنے اظہارِ صداقت کرتے

ہوئے انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہم انگلستان سے تماشائی کی حیثیت سے نہیں آئے ہمیں حالات کو سنوارنا ہے اور ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے، جو نفرت پیدا ہو گئی ہے اُسے دُور کرنا ہے۔

(ایک چپڑاسی اندر آتا ہے)

چپڑاسی : نند کمار ——

کلیورنگ : بھیج دو

(سب کی نگاہیں دروازے پر جم جاتی ہیں۔ نند کمار دروازے میں آتا ہے۔ سر جھکا کر پرنام کرتا ہے اور کھڑاؤں اُتار کر کمرے میں داخل ہوتا ہے نند کمار کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ ہو گی۔ مگر صحت نہایت اچھی ہے جسم پر ڈھاکے کی ململ کی قمیص اور دھوتی ہے۔ چہرے پر ایک ایسا جلال برستا ہے جو تجربہ کار اور باہمت لوگوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔

نند کمار بڑی متانت اور سنجیدگی سے قدم اٹھاتا ہوا کونسل کے قریب آتا ہے)

فرانسس : نند کمار (ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے)

نند کمار : شکریہ (کرسی پر بیٹھتا نہیں)

کلیورنگ : (فرانسس کے سامنے کاغذوں کی طرف اشارہ کر کے) وہ خطوط تم نے بھیجے ہیں؟

کمار: جی ہاں!

ورنگ: تم نے ہندوستان کے گورنر جنرل پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے بہت سا روپیہ رشوت میں لیا ہے۔

کمار: میں نے یہی الزام لگایا ہے اور اس کا ثبوت بھی دے چکا ہوں۔

رنگ: ذرا اسے تفصیل سے بیان کرو۔

کمار: مجھ سے کہا گیا تھا کہ مجھے جو کچھ کہنا ہے گورنر جنرل کی موجودگی میں کہنا ہے

سس: تم وہ باتیں اب بھی کہہ سکتے ہو۔

کمار: اور گورنر جنرل ——؟

ورنگ: تمہیں اس سے کیا تعلق ہے۔ فیصلہ عدالت کرے گی۔

کمار: گورنر جنرل نے رضا خاں کو بنگالے کا اور شتاب رائے کو بہار کا صوبہ دار بنایا تھا۔ یہ دونوں اپنے اپنے صوبوں کے محاصل وصول کر کے کمپنی کے حوالے کرتے تھے۔ رضا خاں سات سال تک اپنے عہدے پر فائز رہا۔ اس سے پہلے یہ کام میرے سپرد تھا۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ رضا خاں نے سات سال کے عرصے میں کم از کم تین کروڑ روپیہ لوگوں سے لوٹا اور شتاب رائے نے نوے لاکھ۔ میں نے یہ واقعہ گورنر جنرل کو بتایا۔ انہوں نے دونوں کو گرفتار کر لیا۔ اب چاہیے یہ تھا کہ دونوں کے خلاف مقدمہ چلایا جاتا اور انہیں سزا ملتی مگر دونوں نے گورنر جنرل کو معقول رشوت دے کر قانون سے نجات

حاصل کرلی۔ رضاخاں نے گورنر جنرل کو دس لاکھ رشوت دی اور شتاب رائے نے چار لاکھ۔ اس کے علاوہ میر جعفر کی بیوہ منی بیگم نے بھی گورنر جنرل کو ڈھائی لاکھ کی رقم رشوت دی اور نواب بنگال کی محافظ مقرر ہو گئی۔ میرے پاس اس کا تحریری ثبوت موجود ہے۔ منی بیگم نے گورنر جنرل کو مرشد آباد میں ایک لاکھ اور قاسم بازار میں ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ دیا ———— منی بیگم نے یہ خط مجھ کو لکھا ہے اور اس میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ اُس نے ڈھائی لاکھ کی رقم گورنر جنرل کے حضور میں پیش کی تھی۔

کلیورنگ: منی بیگم نے یہ خط تمہیں کیوں لکھا تھا؟

نندکمار: اس کی وجہ تو یہ ہے کہ منی بیگم کو مجھ پر کامل اعتماد تھا اور دوسرے اُسے کبھی گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک دن اس کا خط گورنر جنرل کے خلاف ایک تحریری ثبوت کے طور پر پیش کیا جائے گا۔

کلیورنگ: کیا یہ تحریر منی بیگم کی ہے؟

نندکمار: اس کا جواب براہ راست منی بیگم کے دستخط دے رہے ہیں۔

فرانسس: نندکمار، یہاں عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ چونکہ تمہیں گورنر جنرل نے بنگالے کا صوبے دار نہیں بنایا، اس لیے تم ان سے انتقام لینا چاہتے ہو۔

نندکمار: کونسل کو ہر طرح اختیار ہے کہ وہ اسے انتقام سمجھے یا کچھ اور۔ میں نے جس چیز کو حقیقت سمجھا ہے، اس کا اظہار کر دیا ہے۔ جب میں نے گورنر جنرل کو بتایا

اور شتاب رائے کی لوٹ کھسوٹ کا حال بتایا تھا تو انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں بنگالے کا صوبے دار بنایا جائے گا۔ یہ وعدہ پورا نہیں کیا گیا۔ مجھے اس کا رنج ضرور ہے۔ لیکن گورنر جنرل پر میں نے جو الزام لگایا ہے، و اس رنج کا ردِ عمل نہیں ہے! رضا خاں اور شتاب رائے نے میری زبان بند کرنے کے لیے مجھے بھی لاکھوں روپیہ رشوت دینے کا وعدہ کر لیا تھا مگر میں اس کے لیے تیار نہیں تھا اور نہ کبھی تیار ہو سکتا ہوں۔ اگر مجھے دولت کی خواہش ہوتی تو دولت حاصل کرنے کا اس سے بہتر ذریعہ کیا ہو سکتا تھا ——

معاف کیجیے میں یہ بات کہنے پر مجبور ہوں کہ گورنر جنرل نے اس ملک میں جس قسم کی لوٹ کھسوٹ مچا رکھی ہے۔ وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ وہ ہم میں نااتفاقی پیدا کرتا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے خلاف ——

ٹنگز : بات کاٹ کر، نند کمار! اس معاملے کو الجھانے کی کوشش نہ کرو۔ یہ غلط چال ہے تمہاری۔

کمار : صرف میں ہی نہیں میرے ساتھ ہزاروں لوگ اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ ہندوستانیوں کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ نوابوں اور راجاؤں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑوایا جا رہا ہے۔ یہاں کی دولت انگلستان بھیجی جا رہی ہے۔

ٹنگز : نند کمار! تم نے گورنر جنرل پر جو الزام لگایا ہے۔ اسے کمیٹی کے سامنے بیان کرو گے؟ میرا مطلب رشوت کے معاملے سے ہے!

نند کمار : ہر وقت بیان کرنے کے لیے تیار ہوں۔

کلیورنگ : تو اب تم جا سکتے ہو۔ شکریہ!

(نند کمار اسی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ چلا جاتا ہے جس متانت اور سنجیدگی سے آیا تھا)

فرانسس : میں پہلے ہی کہتا تھا۔ معاملہ کتنا نازک ہے۔

کلیورنگ : معاملہ اس لحاظ سے اور بھی نازک ہے کہ یہاں کے لوگ ہم سے متنفر ہوتے جا رہے ہیں۔ نفرت آلود فضا میں حکومت برطانیہ کی پالیسی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

مانسن : لوگوں میں نفرت بڑھ گئی تو ہمیں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا

کلیورنگ : اس وقت ہماری پالیسی کی کامیابی اور ناکامی کا سوال ہے۔ گورنر جنرل سے پوری طرح مواخذہ کرنا چاہیے۔

فرانسس : میری رائے یہ ہے کہ یہاں کے لوگ اس وقت مطمئن ہوں گے جب گورنر جنرل سے مواخذہ کیا جائے گا اور سختی سے کیا جائے گا۔

کلیورنگ : کاغذات تیار کر کے کمپنی کے حوالے کر دینے چاہئیں۔ اگر آپ اس پر رضامند ہیں تو فی الفور مقدمہ تیار کر کے کمپنی کے سپرد کر دیں۔

فرانسس : بالکل!

کلیورنگ : تو اجلاس برخاست ہوتا ہے۔

دوسرا منظر

وارن ہیسٹنگز کا ڈرائنگ روم)

کمرہ کافی آراستہ و پیراستہ ہے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پہ رنگین اور ریشمیں پردے لٹک رہے ہیں۔ مشرقی دروازے کے پاس فرانسیسی سکرین پڑی ہے سکرین سے دور شمالی دیوار کے نزدیک صوفے پہ وارن ہیسٹنگز بیٹھا ہے اور اس کے سامنے کرسی میں کلکتے کی عدالتِ عالیہ کا چیف (میرِ عدالت) سر ایلیجا امپی نظر آ رہا ہے۔ سر ایلیجا ٹھگنے قد کا آدمی ہے۔ عمر ہیسٹنگز کے لگ بھگ ہو گی۔ چھ سات ماہ کا فرق ہو سکتا ہے۔ سر ایلیجا کے چہرے سے پُررعب متانت ٹپک رہی ہے۔ کشادہ پیشانی ہے۔ گفتگو آہستہ آہستہ کرتا ہے۔ وارن ہیسٹنگز کا بچپن کا دوست رہ چکا ہے اس لیے دونوں میں کافی بے تکلفی ہے! ——— اس وقت رات کا پہلا پہر ہے کمرہ شمع دانوں کی روشنی سے منور ہے۔

صوفے کے پاس تپائی پر ایک فائل کھلا پڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ہیسٹنگز ابھی ابھی اس کی ورق گردانی کر رہا ہے)

امپی: لیکن مجھے حیرت ہے تمہاری کونسل کے یہ تین ارکان تمہارے خلاف کیوں ہیں؟

وارن ہیسٹنگز: بے وقوف ہیں۔ ان کی مخالفت سے مجھے جو نقصان پہنچتا ہے وہ تو پہنچے گا ہی: ہندوستان میں برطانوی پالیسی بھی کامیاب نہیں ہو سکے گی!

ایمپی: تمہارے خلاف انہوں نے سارے کاغذات کمپنی کے حوالے کر دیے ہیں۔

وارن ہیسٹنگز: کار۔۔ روائی شروع ہو چکی ہے مگر میں بھی اس مردود برہمن کے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ کرنے والا ہوں۔

ایمپی: اگر اس سے بہتر کوئی صورت ہو سکے تو وہ بھی کر دو!

وارن ہیسٹنگز: اس سے بہتر بھی ایک صورت ہے۔

ایمپی: کیا؟

وارن ہیسٹنگز: ایک سنگین اخلاقی جرم میں اس برہمن پاجی کو قانون کے حوالے کر دینا چاہیے۔

ایمپی: کیا ایسی صورت ہو سکتی ہے ہیسٹنگز؟

وارن ہیسٹنگز: یقیناً — اور میں اس کی تمام تیاریاں مکمل کر چکا ہوں اور اسی سلسلے میں تمہیں آج بلایا ہے۔

ایمپی: مجھے تفصیل بتاؤ۔

وارن ہیسٹنگز: (فائل کو ہاتھ میں لے کر) یہ فائل میں نے اسی مقصد کے لیے حاصل کی ہے — آج سے کچھ عرصہ پہلے کلکتے کے ایک جوہری نے اس پاجی کے خلاف جعل سازی کی نالش کی تھی — اس وقت میں نے مداخلت کر کے اس

مقدمے کو دبا دیا تھا۔

ں : تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟

رن ہیسٹنگز : میں اسے ممنونِ احسان کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنے مقاصد کے لیے اسے استعمال کر سکوں۔ اس شخص کا لوگوں میں بڑا اثر و رسوخ ہے اور ظاہر ہے ایسے لوگ ہمارے بہت کام آ سکتے ہیں۔

ں : ذرا تفصیل بتاؤ۔

رن ہیسٹنگز : واقعہ یوں ہے کہ کلکتے کے ایک صراف بلاقی داس نے ۱۷۶۹ء میں اپنے وارثوں اور قرض خواہوں میں جائداد کی تقسیم کی وصیت کر دی تھی اور اس کا مختار نامہ ایک جوہری موہن پرشاد کے نام لکھا گیا تھا۔ بلاقی داس کی موت کے بعد نند کمار نے ایک جعلی تحریر تیار کر کے بلاقی داس کی بیوی سے اڑتالیس ہزار ایک سو اکیس روپے وصول کرنا چاہے۔ حالانکہ وصیت نامہ میں نند کمار کا صرف دس ہزار کا قرضہ لکھا ہوا تھا۔ چنانچہ موہن پرشاد نے اس کے خلاف جعل سازی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ ابھی مقدمہ چل ہی رہا تھا کہ میں نے مداخلت کرنی ضروری سمجھی اور نند کمار بری کر دیا گیا۔

ں : نند کمار کا اپنا بیان کیا تھا

ن ہیسٹنگز : وہ کہتا ہے کہ یہ رقم دس ہزار کے علاوہ ہے —— اور بلاقی داس نے بقائمی ہوش و حواس اپنے دستخطوں کے ساتھ مجھے یہ تحریر لکھ کر

دی تھی !

ایمپی: تمہارا خیال ہے کہ موہن پرشاد یہ مقدمہ میری عدالت میں دائر کرے گا؟

وارن ہیسٹنگز: یقیناً ——— میں نے سب کام مکمل کر لیا ہے۔

ایمپی: اس تحریر کا کوئی گواہ بھی تو ہوگا !

وارن ہیسٹنگز: اگر موہن پرشاد کو دوبارہ مقدمہ چلانے کی ترغیب دی جا سکتی ہے تو اس کے گواہ کو راہ راست پر نہیں لایا جا سکتا ؟

ایمپی: ضرور لایا جا سکتا ہے !

(دروازے کا ریشمی پردہ ہٹا کر لیڈی ہیسٹنگز آتی ہے۔ یہ تیس پینتیس سال کی جرمن نژاد عورت ہے۔ چہرہ نہایت دل کش ہے۔ پلکیں لمبی لمبی اور ہونٹ باریک ہیں۔ آنکھوں اور ہونٹوں پر ہر وقت ایک دل فریب مسکراہٹ چھائی رہتی ہے ...... لیڈی ہیسٹنگز دروازے میں رک کر مسکراتی ہے ابھی اس کی نظر سر ایلیا ایمپی پر نہیں پڑی)

وارن ہیسٹنگز: ابھی نہیں ڈارلنگ !

لیڈی ہیسٹنگز: اوہ ——— (مڑنے لگتی ہے۔ یکایک ایمپی کو دیکھ کر) ہیلو ایمپی۔

ایمپی: ہیلو ——— سیر سے واپس آ گئیں !

لیڈی ہیسٹنگز: ابھی ابھی آئی ہوں ——— اچھا آپ کام کیجئے۔ گڈ نائٹ۔

ایمپی: گڈ نائٹ !

(لیڈی ہیسٹنگز چلی جاتی ہے)

ارن ہیسٹنگز: ڈیر امپی۔ امید رکھو چند دن کے بعد یہ کیس پیش ہو جائے گا!

پی: اگر ایسا ہو جائے تو نتیجہ بہت اچھا ثابت ہو گا!

ارن ہیسٹنگز: ایسا ہو گا اور ضرور ہو گا!

پی: (داہنے ہاتھ کی مٹھی بھینچ کر) اگر جعل سازی کا جرم ثابت ہو جائے تو یہ کمینہ برہمن

زندہ نہیں رہے گا! اطمینان رکھو!

ارن ہیسٹنگز: مجھے ہر طرح اطمینان ہے۔

پی: آل رائٹ (اٹھ بیٹھتا ہے) گڈ نائٹ!

ارن ہیسٹنگز: گڈ نائٹ!

(امپی جانے لگتا ہے۔ وارن ہیسٹنگز دروازے تک اس کے ساتھ جاتا

ہے۔ امپی کے جانے کے بعد وہ واپس آتا ہے۔ فائل پر سرسری نظر ڈالتا

ہے اور صوفے میں نیم دراز ہو جاتا ہے ---

سکرین کے قریب بارول آتا ہے ---- ہیسٹنگز اسے دیکھتا ہے)

ارن ہیسٹنگز: کیوں؟

رول: آگیا ہے۔

ارن ہیسٹنگز: گڈ

(وارن ہیسٹنگز کمرے سے نکل جاتا ہے۔ بارول چند لمحے توقف کرتا ہے۔

جب وارن ہیسٹنگز دوسرے دروازے سے نکل جاتا ہے تو واپس جاتا ہے وقفے کے بعد واپس آتا ہے تو اس کے ساتھ موہن پرشاد بھی ہے موہن پرشاد لمبے قد کا سادہ آدمی ہے۔ نند کمار کی طرح دھوتی اور قمیص میں ملبوس ہے۔ چہرہ اس قسم کا ہے کہ اس پر کسی قسم کا اثر نمایاں نہیں ہے۔ عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی —— بارول موہن پرشاد کو کرسی پر بٹھا دیتا ہے اور خود اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ موہن پرشاد کرسی پر بیٹھتے ہوئے دو ڈبے جنہیں وہ اٹھاتے ہوئے کمرے میں آتا ہے تپائی پر رکھ دیتا ہے ۔

بارول: آپ کو پہلے کبھی لیڈی ہیسٹنگز سے ملاقات کا موقعہ نہیں ملا۔

موہن پرشاد: جی نہیں!

بارول: عجیب بات ہے۔ انہیں تو ہیروں اور جواہرات کا بے حد شوق ہے کلکتے کی شاید ہی کوئی ایسی جوہری کی دوکان ہوگی۔ جہاں وہ نہ گئی ہوں۔

موہن پرشاد: کئی مرتبہ میرا دل چاہا کہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی چیزیں پیش کروں —— مگر اس خیال نے روک دیا کہ شاید وہ پسند ہی نہ کریں۔

بارول: آپ کے پاس خاص چیز کیا ہے؟

موہن پرشاد: ہار

رول : ہار تو انہیں بے حد پسند ہیں۔

وہن پرشاد : پھر تو مجھے افسوس ہے کہ اب تک ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔

رول : خیر کوئی بات نہیں۔

(لیڈی ہیسٹنگز آتی ہے۔ اُسے دیکھ کر دونوں کھڑے ہو جاتے
ہیں۔ لیڈی ہیسٹنگز موہن پرشاد کے سامنے بیٹھ جاتی ہے۔)

رول : (لیڈی ہیسٹنگز سے) کلکتے کے مشہور جوہری موہن پرشاد۔ کل انہی کا ذکر
ہو رہا تھا۔

یڈی ہیسٹنگز : NICE ! مجھے افسوس ہے اس سے پہلے کبھی آپ کو بلا نہ سکی
در اصل مجھے آپ کی خبر ہی نہیں تھی۔

ارول : یہ خود کہہ رہے ہیں کہ کئی مرتبہ میرا دل اپنی چیزیں پیش کرنے کے لیے
چاہا مگر اس خیال نے روک دیا کہ شاید لیڈی ہیسٹنگز پسند نہ کریں۔

یڈی ہیسٹنگز : اچھی چیز مجھے کیوں نہ پسند ہوگی! —— (موہن پرشاد سے)
آپ لے آئے ہیں ہار!

وہن پرشاد : جی ہاں! ملاحظہ فرمائیے!

(تپائی سے ڈبہ اُٹھاتا ہے۔ اُسے کھولتا ہے اور
ہار نکال کر لیڈی ہیسٹنگز کے ہاتھ میں دے دیتا ہے)

یڈی ہیسٹنگز : BEAUTIFUL

بارول: پسند ہے آپ کو؟

لیڈی ہیسٹنگز: اور بھی دکھائیے —— (نام بھول جاتی ہے)

بارول: ان کا نام موہن پرشاد ہے۔

لیڈی ہیسٹنگز: (خاص انداز سے مسکرا کر موہن پرشاد کی طرف دیکھتے ہوئے) مسٹر موہن پرشاد!

موہن پرشاد: بہت بہتر!

(موہن پرشاد دوسرے ڈبے سے ہار نکال کر لیڈی ہیسٹنگز کے ہاتھ میں دے دیتا ہے)

لیڈی ہیسٹنگز: بہت اچھا —— یہ ہمیں پہلے سے بھی زیادہ پسند ہے

بارول: دونوں پسند ہیں آپ کو؟

لیڈی ہیسٹنگز: ہاں! دونوں پسند ہیں۔

بارول: تو انہیں ضرور خرید لیجیے۔

لیڈی ہیسٹنگز: ضرور، مسٹر موہن پرشاد! آپ کو جب کبھی آنا ہو —— فوراً آ جایا کیجیے —— میں ان دونوں ہاروں کو خرید لوں گی —— دو لاکھ ٹھیک ہے قیمت!

موہن پرشاد: (گھبرا کر —— اسے اتنی قیمت کا تصور تک بھی نہیں ہو سکتا تھا) جی! ——

(لیڈی ہیسٹنگز بے اختیار ہنس پڑتی ہے)

بارول: موہن پرشاد! تم خوش نہیں ہو گیا —— !

موہن پرشاد: (بے اختیار ہاتھ جوڑ کر) میں ـــــ بہت خوش ہوں!

لیڈی ہیسٹنگز: آپ آئندہ بھی آتے رہیں گے نا!

موہن پرشاد: جی ضرور۔ خدمت میں حاضر ہوتا رہوں گا۔ آپ نے ــــــ (اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے جذبات کا اظہار کس طرح کرے) ضرور آتا رہوں گا۔

بارول: مسٹر موہن پرشاد! یہ نندکمار آپ کا عزیز ہے کوئی۔

موہن پرشاد: جی ہاں ـــــ مگر عرصہ ہوا ہمارے تعلقات ختم ہو چکے ہیں۔

لیڈی ہیسٹنگز: بہت چالاک آدمی ہے۔

موہن پرشاد: جی ہاں! آج کل گورنر جنرل کو بدنام کر رہا ہے؟

بارول: یہ شخص تمہارا بھی دشمن ہے۔

موہن پرشاد: جی ہاں۔

بارول: دشمنی کی وجہ کیا ہے؟

موہن پرشاد: یہ شخص چاہتا تھا کہ بلاقی داس اسے اپنی جائداد کا مختار بنا دے مگر اس نے اپنی وصیت میں مجھے مختار نامہ دے دیا۔

لیڈی ہیسٹنگز: یہ شخص ہر شریف آدمی کا دشمن ہے۔ ہاں مسٹر پرشاد! تم نے اس کے خلاف مقدمہ بھی کیا تھا؟

موہن پرشاد: کیا تھا مگر کچھ نہ ہو سکا۔ گورنر جنرل نے دخل دے کر اُسے بچا لیا۔

لیڈی ہیسٹنگز: ایسے شخص کو تو کبھی نہیں بچانا چاہیے۔

بارول: میں بتاؤں مسٹر موہن پرشاد! کلکتے میں جو نئی عدالت عالیہ قائم ہوئی ہے آپ اس پر اس عدالت میں مقدمہ دائر کر دیں۔

موہن پرشاد: (ہچکچاتے ہوئے) جی!

لیڈی ہیسٹنگز: یہ عدالت پہلی جیسی عدالت نہیں ہے۔ آپ ضرور مقدمہ جیت لیں گے!

بارول: ہمارا مشورہ یہی ہے۔

(بارول، لیڈی ہیسٹنگز کو خاص انداز سے دیکھتا ہے۔ لیڈی ہیسٹنگز تپائی پر سے رومال ہٹا دیتی ہے۔ تپائی پر نوٹوں کے بنڈل پڑے ہیں)

لیڈی ہیسٹنگز: یہ لیجیے ——

موہن پرشاد: (خوشی سے چہرہ سرخ ہو گیا ہے) شکریہ!

بارول: مسٹر موہن پرشاد! بہتر ہے کہ آپ مقدمہ دائر کر دیں۔ آپ کو ضرور کامیابی ہوگی —— یہ آپ کا بھی دشمن ہے —— ہر شریف آدمی کا دشمن ہے۔ ضرور مقدمہ دائر کیجیے!

موہن پرشاد: ضرور کروں گا۔

لیڈی ہیسٹنگز: او تھینکس (کمپلیمنٹ، اپنی غلطی کا احساس کرکے) مسٹر پرشاد آپ آئندہ بھی آتے رہیں گے۔

بارول: (جلدی سے) ضرور آتے رہیں گے۔

موہن پرشاد: کیوں نہ آؤں گا — یہ تو میرا فرض ہے۔ آپ بہت ہی اچھے اور مہربان ہیں

لیڈی ہیسٹنگز: (مسکرا کر) اور یہ آپ کا نندکمار تو ہمیں بہت برا ثابت کر رہا ہے۔

موہن پرشاد: بے وقوف ہے، کمینہ کہیں کا۔

بارول: مسٹر موہن پرشاد! ہندوستان میں جہاں تم جیسے نیک اور اچھے آدمی ہیں
وہاں نندکمار جیسے غیر ذمے دار لوگ کیوں ہیں؟

لیڈی ہیسٹنگز: ہمیں تو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اسی کو نقصان ہوگا۔ جاہل لوگ
ہمیں جانتے نہیں — ہم کیوں رشوت لیں گے؟

بارول: جعل سازی خود کرتا ہے۔

لیڈی ہیسٹنگز: ایسے آدمی کو سزا ملنی چاہیے۔

موہن پرشاد: ضرور ملے گی۔ میں دوبارہ مقدمہ دائر کر دوں گا۔

لیڈی ہیسٹنگز: اور کیا۔ ایسی بری باتیں کر کے خواہ مخواہ ہندوستانیوں کو بدنام
کر رہا ہے۔

موہن پرشاد: تو اب مجھے اجازت دیجیے۔

لیڈی ہیسٹنگز: اچھا۔

(موہن پرشاد نوٹوں کے بنڈل اٹھانے لگتا ہے
لیڈی ہیسٹنگز بارول کی طرف مسکرا کر دیکھتی ہے)

تیسرا منظر

(کلکتے کی عدالتِ عالیہ :—— جولائی کا آخری ہفتہ —— گرمی پورے شباب پر ہے ۔

اپنی مخصوص کرسیوں میں عدالتِ عالیہ کے چاروں جج بیٹھے ہیں ۔ چاروں کے سروں پر "وِگ" ہیں ۔ درمیان میں "سر ایلیجا امپی" ہے ۔ دائیں جانب ہائیڈ اور چیمبرس ہیں اور بائیں طرف لمیسٹر ۔ کمرے میں چاروں طرف لوگ کھڑے ہیں ۔ جو بڑی بیتابی سے سر ایلیجا امپی کی طرف دیکھ رہے ہیں جو فیصلہ لکھ رہا ہے ۔

مجرموں کے کٹہرے میں نند کمار کھڑا ہے ۔ نند کمار کے چہرے پر تھکاوٹ اور اضمحلال نمایاں ہے ۔ مگر اس کے باوجود اس کے رعب و جلال میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ لوگ سرگوشی کے انداز میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ بے چینی سے چیف جسٹس کو دیکھتے بھی جاتے ہیں ۔

اسی طرح چند لمحے گزر جاتے ہیں ۔ سر ایلیجا امپی قلم ہاتھ سے رکھ دیتا ہے ۔ "سنو، سنو" ۔ دیکھو ، "خاموش" —— کہتی ہوئی آوازیں بلند ہوتی ہیں ۔ —— سر ایلیجا میز پر ہاتھ مارتا ہے)

سر ایلیجا : خاموش حضرات !

(مکمل خاموشی چھا جاتی ہے)

اس مقدمے کو شروع ہوئے کئی دن گزر چکے ہیں۔ عدالت نے اس کے ہر پہلو پہ پوری طرح غور کیا ہے۔ کلکتے کے جوہری موہن پرشاد نے کلکتے کے سابق صوبے دار نند کمار پہ یہ الزام لگایا ہے کہ نند کمار نے اڑتالیس ہزار ایک سو اکیس روپے کے لیے جعلی دستاویز تیار کی ہے۔ نند کمار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ دستاویز اصلی ہے اور اس پہ متوفی بلاقی داس کے جو دستخط ہیں وہ جعلی نہیں ہیں۔ یہ مقدمہ آج سے ساڑھے تین سال پہلے ایک مقامی عدالت میں چل چکا ہے۔ مگر اس کا فیصلہ نہیں ہوا تھا — اس عدالت میں یہ مقدمہ دوسری مرتبہ دائر کیا گیا ہے — عدالت نے ہر ممکن طریقے سے اس مقدمے پہ غور کیا ہے اور عدالت اس نتیجے پہ پہنچی ہے کہ موہن پرشاد نے نند کمار پہ جو الزام لگایا ہے وہ درست ہے۔ نند کمار فی الواقعی جعل سازی کا مرتکب ہو چکا ہے۔ انگلستان میں اس جرم کی سزا موت ہے۔ عدالت اسی سزا کا یہاں اعلان کرنے پہ بھی مجبور ہے۔ نند کمار، عمر ساٹھ سال، ذات برہمن کو جعل سازی کے جرم میں پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔

(یہ الفاظ سنتے ہی لوگوں کی ایسی کیفیت ہوتی ہے جیسے وہ زلزلے کا جھٹکا محسوس کر رہے ہوں۔

نند کمار کا چہرہ یکلخت ہلدی کی طرح زرد پڑ جاتا ہے۔ اس کے پاؤں لڑکھڑاتے

ہیں اور وہ سہارا لینے کے لیے کٹہرے کو تھام لیتا ہے —— دو چار لمحوں کے بعد وہ اپنے آپ پر قابو پا لیتا ہے۔ لوگوں کی شوری کیفیت جاگنے لگتی ہے۔ انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا۔ ایک دوسرے کی طرف مستفسرانہ دیکھتے رہتے ہیں ”گویا نگاہوں ہی نگاہوں میں پوچھ رہے ہیں واقعی یہ فیصلہ ہو گیا ہے —— واقعی ایسا ہو گیا ہے ؟

دو چار لمحے اور گزر جاتے ہیں۔

”پھانسی کی سزا —— جعل سازی کی سزا، موت ——“

اور اسی قسم کے فقرے بلند ہو رہے ہیں۔

سر ایلیجا فیصلے کے کاغذ سے نگاہیں ہٹا لیتا ہے۔ سرسری طور پر لوگوں کو دیکھتا ہے۔

ایک لمحے کے لیے پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس کے بعد وہی الفاظ کہتی ہوئی رکی رکی، گھٹی گھٹی آوازیں ابھرنے لگتی ہیں۔

نند کمار کا جھکا ہوا سر، سر ایلیجا کی طرف مڑتا ہے۔ اس کی آنکھیں اب سرخ ہیں۔ گردن اکڑی ہوئی ہے۔ لوگ خاموش ہو کر بڑی بے تابی سے اس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔)

ندکمار : مسٹر ایلیجا! میں نے اپنی موت کا فیصلہ سن لیا ہے۔ میں جانتا ہوں یہ قانون کا فیصلہ نہیں ہے (آواز میں جوش بڑھتا جا رہا ہے) یہ انصاف کا

فیصلہ نہیں ہے بلکہ گورنر جنرل کے انتقام کا فیصلہ ہے —— گورنر جنرل اور چیف جسٹس کی سازش کا فیصلہ ہے۔

سر ایلیجا: مجرم کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس قسم کی باتیں کرنا فضول ہے۔ قانون اور انصاف نے جو فیصلہ کیا ہے —— عدالت نے اُسی فیصلے کا اعلان کر دیا ہے!

ند کمار: تم اسے انصاف کہتے ہو ——؟ اگر یہ انصاف ہے تو دُنیا میں ناانصافی کس چیز کا نام ہے؟

سر ایلیجا: عدالت نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے —— مجلس برخاست ہوتی ہے

(اُٹھنے لگتا ہے)

ند کمار: مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ ضرور کہوں گا۔

(لوگوں کا شور "سنو، سنو" کی آوازیں)

سر ایلیجا: یہ عدالت ہے کوئی تماشہ نہیں ہے۔

ند کمار: اب تک جو کچھ ہوا ہے۔ اس کی حیثیت کٹھ پتلیوں کے تماشے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے —— مجھ جیسے مالدار شخص کے خلاف اتنی حقیر رقم کے لیے جعل سازی کا مقدمہ کرنا تماشہ نہیں تو اور کیا ہے۔ اب تک جتنے لوگ یہاں آکر بولتے رہے ہیں وہ صرف کٹھ پتلیاں تھے جو گورنر جنرل اور اس کے ساتھیوں کے اشاروں پر ناچتے رہے ہیں آج سارے کھیل —— اس سارے

تماشے کا مقصد صرف یہ تھا کہ گورنر جنرل کے مخالف کو اپنی راہ سے ہٹا دیا جائے —— اُسے کسی طرح ختم کر دیا جائے اور آج یہ مقصد پورا ہو گیا ہے —— موہن پرشاد اور اس جیسے دوسرے کمینہ اور ذلیل فطرت لوگوں کو جس کام کے لیے رشوت دی گئی تھی —— وہ کام ختم ہو گیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں آج ہی نند کمار کے خلاف جعل سازی کا مقدمہ چلانے کی کیوں ضرورت پیش آئی۔ —— جب ایک مرتبہ مقامی عدالت نے اسے داخل دفتر کر دیا تھا۔ تو پھر اتنے عرصے کے بعد اسے زندہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ضرورت صرف یہ تھی کہ گورنر جنرل اپنے مخالف کو موت کے حوالے کر کے اپنی مخالفت کے طوفان کو دبا دینا چاہتا تھا اور میری موت کے بعد مخالفت کا یہ طوفان خود بخود دب جائے گا! مگر گورنر جنرل کو معلوم ہونا چاہیے کہ چیف جسٹس کے فیصلہ صادر کرنے کے بعد یہ مقدمہ ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ مقدمہ دوبارہ ہوگا —— میری موت کے بعد ہوگا اور اس وقت ہوگا جب میرے ہم وطن تم لوگوں کو —— تم سفید چمڑی والے مکار تاجروں کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے۔ اس وقت تمہاری جگہ مجرموں کے کٹہرے میں ہوگی۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مجرم نند کمار تھا جس کے خلاف جعل سازی کا مقدمہ کیا گیا تھا یا وارن ہیسٹنگز اور سر ایلیجا امپی تھے جنہوں نے سازش کر کے ایک بے گناہ کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا تھا —— تم نے میرے وطن میں چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح

لوٹ کھسوٹ مچا رکھی ہے۔ یہ لوٹ کھسوٹ آج جاری ہے۔ کل جاری نہیں رہے گی۔ وقت آنے پر تمہیں اسی طرح اس سرزمین سے نکال دیا جائے گا۔ جس طرح چوروں اور ڈاکوؤں کو گھروں سے نکال دیا جاتا ہے —— آج تمہیں موقع ملا ہے۔ ظلم پر ظلم کرتے جاؤ —— بے گناہوں کو پھانسی پر لٹکاتے رہو —— اور ہم میں پھوٹ ڈال کر فائدہ اٹھاتے رہو۔ مگر وہ وقت آنے والا ہے جب یہی رعیت جنہیں تم بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک رہے ہو —— تمہیں مکار، غاصب، زرلٹیرا سمجھ کر، یہاں سے چلے جانے پر مجبور کر دیں گے —— تم مجھے مار کر بھی نہیں مار سکو گے —— میں مر کر جیوں گا —— جی جی کر مروں گا۔

(لوگوں کا ہجوم بے قرار ہو جاتا ہے۔ فضا میں آوازیں گونجنے لگتی ہیں "یہ ظلم ہے"۔ "یہ زیادتی ہے"۔ "اپنا فیصلہ بدلو"۔ سر ایلیجا امپی کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر میز پر ہاتھ مار کر لوگوں کو خاموش ہونے کے لیے کہتا ہے۔ شور ختم ہو جاتا ہے)

: حضرات! عدالت اس فیصلے پر غور کرے گی۔

("کب کب" کا شور ہونے لگتا ہے)

: (میز پر ہاتھ مار کر) چند دن تک —— آپ مطمئن رہیں!

(سپاہی نندکمار کے گرد حلقہ ڈال دیتے ہیں۔ وہ بڑے وقار اور تحمل کے ساتھ

قدم اٹھانے لگتا ہے۔ جب تک وہ دروازے سے باہر نہیں نکل جاتا۔ لوگ طرح طرح کے فقرے کستے رہتے ہیں۔ نندکمار جب دروازے سے باہر نکل جاتا ہے تو سرپنچ بھی اور دوسرے پنچ بھی روانہ ہو جاتے ہیں۔ لوگ ابھی تک کھڑے ہیں۔!)

چوتھا منظر

(جیل خانہ کا بند آہنی اور مقفل دروازہ ۔۔۔ دروازے کے سامنے لوگوں کا ہجوم)

دن: ۵ اگست، بروز ہفتہ ۱۹۴۲ء

وقت: صبح کے سات بجنے میں کچھ منٹ باقی ہیں۔ روشنی پوری طرح پھیلی نہیں۔ فضا میں گھٹن اور بوجھل پن۔ ہوا رک رک کر چل رہی ہے۔ بہت آہستہ جیسے شکستہ پا ہو۔ ہجوم میں مرد بھی ہیں، عورتیں بھی اور بچے بھی۔ سب دروازے کے سامنے کھڑے ہیں۔ سب کے چہروں پہ غم و ملال کے گہرے اثرات چھائے ہوئے ہیں۔

عورتیں رو رہی ہیں اور بچے ان کی دیکھا دیکھی سانحے کا اندازہ کیے بغیر سر جھکائے اس طرح خاموش کھڑے ہیں جیسے اُن کے معصوم دلوں پر غم کا بوجھ آ پڑا ہو۔ نگاہیں بار بار آہنی دروازے کی طرف اُٹھتی ہیں اور پھر

خود بخود جُھک جاتی ہیں۔

ہجوم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کا اضطراب بھی بڑھتا جا رہا ہے۔

سرگوشیوں کی گھٹی گھٹی کیفیت میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک عورت کے رونے کی آواز بلند ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک اس قسم کی آواز آنے لگتی ہے۔ جیسے بہت سی عورتیں ایک ساتھ سسکیاں بھر رہی ہیں!

دُور سے کلاک سات بجنے کا اعلان کرتا ہے۔ مکمل سکوت پھیل جاتا ہے۔ کلاک کی آواز اس بوجھل سکوت میں ڈوب ڈوب کر اُبھر رہی ہے۔ پھر اُبھر کر پھر ڈوب رہی ہے۔

ہجوم میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے سمندر کی سطح پر طوفان برپا ہو جائے۔

سب دروازے کی طرف بھاگتے ہیں۔ مرد، عورتیں، بچے، سب کے سب دروازے کے دونوں پٹ ایک دوسرے سے جُدا ہونے لگتے ہیں۔

غم و اندوہ کی بجائے اضطراب اور بے چینی چھا گئی ہے۔ دل دھڑک رہے ہیں۔ آنکھیں پھیل گئی ہیں اور فضا پر ایک اضطراب انگیز سکوت مسلط ہے۔ سپاہی لوگوں کو پیچھے ہٹاتے ہیں۔ مگر ہجوم ہے کہ پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیتا۔

"پیچھے ہٹ جاؤ"۔ ایک سپاہی للکارتا ہے۔ مگر ہجوم کے اضطراب اور جوش میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یک لخت سب کے سب اپنی جگہ پر رُک جاتے ہیں۔ سانس روکے نگاہیں دروازے کے اندر گاڑے بے حس و حرکت۔ نند کمار دروازے پر آتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک ایسا جلال اور ایک ایسی عظمت نمایاں ہے کہ دیکھنے والے فرطِ احترام سے بے اختیار نگاہیں جھکا لیتے ہیں۔ اُس کی کشادہ پیشانی پر فکر و ملال کا ہلکا سا غبار بھی نہیں ہے۔ آنکھوں میں سُرخی جھلک رہی ہے اور اس سے اس کے چہرے کے جلال میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

لوگوں پر ایسی مرعوبیت طاری ہو گئی ہے کہ سب رونا دھونا بھول گئے ہیں۔ خاموش کھڑے ہیں —— کسی کو یہ احساس نہیں ہے کہ کیا ہونے والا ہے —— کیا ہو رہا ہے

نند کمار قدم اُٹھاتا ہے —— ایک عورت روتی ہوئی آتی ہے اور اس کے قدموں میں گر پڑتی ہے۔ نند کمار اُسے اُٹھاتا ہے —— عورت سسکیاں بھرنے لگتی ہے

نند کمار مجمع کی طرف دیکھتا ہے —— اور اپنی صاف خلوص سے لبریز اور بلند آواز میں کہنے لگتا ہے۔

نند کمار: تمہیں رونا نہیں چاہئے —— تم کیوں رو رہے ہو۔ اس لیے کہ میں مر رہا ہوں۔ میں مر رہا ہوں ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے —— میں ہمیشہ گناہ

بے گناہی کا داغ بن کر وارن ہیسٹنگز اور امپی کی پیشانیوں پر نمایاں رہوں گا (آواز میں جوش) میں آج گوشت پوست کا کوئی انسان نہیں ہوں بلکہ ایک آدرش ہوں ـــ اجنبی قوت کی ناانصافی، ظلم اور لوٹ کھسوٹ کو مٹا دینے والا آدرش ہوں ـــ یہ آدرش زندہ رہے گا ـــ نند کمار زندہ رہے گا اپنے راستے پر چلتے جاؤ اور مجھے خوشی خوشی اپنی راہ پر جانے دو۔

(لوگوں کی نگاہیں اس کے پُرعظمت اور باوقار چہرے پر جمی ہیں۔ سب کے سب سانس روکے بت بنے اس کی طرف دیکھ رہے ہیں ـــ نند کمار دونوں ہاتھوں کو ہوا میں اس طرح لہراتا ہے ـــ جیسے کہہ رہا ہو مجھے جانے کے لیے راستہ دو۔ لوگ درمیان میں راستہ بنا دیتے ہیں

ایک بچہ آتا ہے اور اس کی ٹانگ سے لپٹ جاتا ہے۔ یہ نند کمار کا پوتا ہے۔ نند کمار اسے گود میں اٹھاتا ہے۔ پیار کرتا ہے اور پھر اسے سسکیاں بھرتی ہوئی ماں کی گود میں دے دیتا ہے

نند کمار چلا جا رہا ہے ـــ پھانسی کے تختے کی طرف قدم اٹھا رہا ہے بغیر رکے، بغیر لغزش کے، اس بہادری کے ساتھ گویا موت کی طرف نئی زندگی حاصل کرنے جا رہا ہے۔

آہ و زاری بلند ہو رہی ہے۔ چیخیں بلند ہو رہی ہیں عورتیں فرطِ صدمہ سے نڈھال ہو ہو کر گر رہی ہیں ـــ بچے بلک رہے ہیں۔

فضا میں سسکیوں سے چیخوں سے ایک ہنگامہ برپا ہے —— اور رونے والوں کے درمیان ، چیخنے والوں کے قریب نندکمار اُسی ہمت و جرأت کے ساتھ قدم اٹھائے جا رہا ہے جس ہمت و جرأت کے ساتھ اُس نے کونسل کے سامنے گورنر جنرل کے خلاف رشوت کا الزام لگایا تھا ۔)

پانچواں منظر

اسی دن ۔ ساڑھے نو بجے ۔

وارن ہیسٹنگز کا ڈرائنگ روم

کمرے میں وارن ہیسٹنگز ، سر ایلیجا امپی اور لیڈی ہیسٹنگز ایک میز کے گرد کرسی پر بیٹھے ہیں ۔ میز پر شراب کی بوتلیں اور پیگ نظر آ رہے ہیں ۔ دورِ شراب جاری ہے تینوں کے چہروں پر فتح مندانہ مسرت کی سُرخی نمایاں ہے

وارن ہیسٹنگز : (خالی پیگ رکھ کر دوسرا پیگ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے) اس ملک میں ہماری پالیسی کبھی ناکام نہیں ہو سکتی ۔

امپی : اس میں کیا شک ہے ۔

وارن ہیسٹنگز : یہ پاگل کونسل اس پالیسی کو نہیں سمجھ سکی —— بالکل فول (FOOL)

امپی : اس سے بہتر پالیسی اس ملک کے لیے ہو ہی نہیں سکتی ۔ دو آدمیوں کو لڑا

دوا اور پھر اُن کے ہاتھوں میں بندوقیں دے دو۔ جو مر جائے گا وہ موت کے قبضہ میں چلا جائے گا اور جو نڈھال ہو کر آسرا ڈھونڈے گا وہ یقیناً ہمارے قبضے میں آجائے گا —— Excellent Policy

(دوسرا پیگ اُٹھاتا ہے)

لیڈی ہیسٹنگز: Miracle —— (ہنس پڑتی ہے)

امپی: اس معاملے میں لیڈی ہیسٹنگز نے بھی کافی اہم پارٹ ادا کیا ہے۔

وارن ہیسٹنگز: (لیڈی ہیسٹنگز کی طرف محبت انگیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) —— very nice woman.

(بارول آتا ہے۔ اس کا چہرہ کسی قدر فکرمند ہے)

امپی: ہیلو مائی ڈیر بارول! اتنی دیر سے کیوں آئے ہو تم؟

وارن ہیسٹنگز: مر گیا پاجی برہمن (غصّے میں پیگ پرے پھینک دیتا ہے)

بارول: (کرسی میں بیٹھتے ہوئے) عجیب واقعہ!

لیڈی ہیسٹنگز: بارول بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں!

بارول: میں ساری زندگی میں نہیں بھول سکتا —— بلا کا بہادر انسان تھا

وارن ہیسٹنگز: (پیگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے) چھوڑو اب اس قصّے کو۔ مر گیا نا وہ بدمعاش!

بارول: مر گیا مگر کس جرأت —— کس بہادری کے ساتھ —— میں اس کی عزت

کے واقعے کو کبھی نہیں بھول سکوں گا! میں جیل سے پھانسی کے میدان تک اُس کے ساتھ رہا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کے چہرے پر گھبراہٹ نہیں دیکھی۔

امپی: بہت خوفناک انسان تھا ـــــ ایسے شخص ملکوں میں انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔

وارن ہیسٹنگز: (تیزی سے پیگ حلق میں انڈیلتے ہوئے) Damn

امپی: ہمیں ایک بہت بڑے اور خطرناک دشمن سے نجات مل ہے۔

بارول: آپ کچھ کہیں۔ مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اُس جیسا بہادر انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ موت سے وہ ڈرتا ہی نہیں تھا۔ پھانسی کے تختے کی طرف اس طرح قدم اٹھا رہا تھا جیسے ـــــ جیسے موت کی طرف نہیں زندگی کی طرف جا رہا ہے۔ نہ تو اُس کی ٹانگوں کو لغزش ہوئی اور نہ ہی اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ جیسا تھا ویسے کا ویسا رہا ـــــ سیڑھی پر قدم رکھنے سے پہلے اُس نے بیٹے کو گلے سے لگایا۔ اور بے خوف و خطر صاف اور پُرجوش لہجے میں بولا۔ "میری تمہیں اور تمام ہندوستانیوں کو یہی وصیت ہے کہ ان سفید چمڑی والے ڈاکوؤں کو جلد سے جلد اپنے ملک سے نکال دو۔"

وارن ہیسٹنگز: (غصے سے خالی پیگ پرے پھینکتے ہوئے) پاجی!

بارول: یہ کہتے ہوئے جب اُس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کی آنکھوں میں سُرخی دوڑ گئی ـــــ جیسے بجھی ہوئی آگ یک لخت بھڑک اُٹھے۔ اُسے ہم سے نفرت

نفرت تھی ـــ وہ ہندوستان میں ہمارا سب سے بڑا دشمن تھا ـــ میں چاہتا تھا کہ اُسے جلدی جلدی ختم کر دیا جائے۔ مبادا اس کے الفاظ اس نازک وقت پر لوگوں میں بغاوت کی آگ لگا دیں۔

ن ہیسٹنگز : ابھی نہیں ـــ ابھی بیسیوں نند کماروں کی ضرورت ہے۔

ول : اُس نے آخری وقت میں کہا تھا ـــ "میں مر نہیں رہا ـــ میں مر مر کر جیوں گا ـــ جی جی کر مروں گا ـــ" اور اس کے بعد اس نے بیٹے کو رخصت کر دیا۔ بیٹے کا بُرا حال تھا۔ رنج و غم سے وہ اس قدر نڈھال ہو گیا تھا کہ اس سے ایک قدم بھی نہیں اُٹھایا جاتا تھا ـــ اس کا جسم لرز رہا تھا۔ کئی لوگوں نے اُسے سنبھالا اور لے کے جانے لگے۔ مگر نند کمار اُسی طرح کھڑا رہا، جس طرح کھڑا تھا۔ اُس نے کسی کمزوری کا اظہار نہ کیا۔ وہ اپنے آپ کو شہید سمجھ رہا تھا ـــ اُسے کامل یقین تھا کہ اس کی موت شہادت ہوگی اور وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اُس نے خود اپنی پُشت پر ہاتھ رکھ دیے۔ جب اس کے ہاتھ باندھ دیے گئے تو اُس کے چہرے پر سیاہ کپڑا باندھا جانے لگا اُس نے سیڑھیوں پر چڑھتے وقت کسی سہارے کی ضرورت نہیں سمجھی ـــ اُس وقت بھی اُس کی ٹانگوں میں لغزش نہ ہوئی ـــ اُس وقت میں اپنے اندر ایک عجیب کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ میں اس کی بہادری سے متاثر تھا یا کسی مبہم خوف سے ـــ میں کہہ نہیں سکتا ـــ سُولی کا تختہ ہٹا دینے

کے ڈھائی منٹ بعد لاش زمین پر آ پڑی۔ میرے دل میں بڑی خواہش تھی کہ اس کا مردہ چہرہ دیکھیں مگر میں دیکھ نہ سکا ـــ لاش فوراً جلانے کے لیے برہمنوں کے حوالے کر دی گئی۔

لیڈی ہیسٹنگز: (متاثر ہو کر) Brave man

وارن ہیسٹنگز: (بدستور غیر متاثر حالت میں) جل گئی لاش ؟

بارول: ہاں !

(شور سنائی دیتا ہے)

امپی: شور کیسا ہے ؟

بارول: شاید وہ لوگ ہیں !

(کھڑکی کی طرف جاتا ہے اور نیچے دیکھنے لگتا ہے)

وارن ہیسٹنگز: کون سے لوگ ؟

بارول: (واپس آ کر) وہ لوگ احتجاج کر رہے ہیں !

امپی: (گھبرا کر) زیادہ لوگ ہیں !

وارن ہیسٹنگز: احتجاج کرنے آ گئے ہیں ـــ پاجی !

لیڈی ہیسٹنگز: (گھبرا کر) وہ کیا کریں گے ـــ وہ کیا کرنے آ گئے ہیں !

وارن ہیسٹنگز: (مطمئن بیٹھے ہیں) کوئی فکر نہ کرو ـــ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا بے فکر ہو کر پیو ـــ خوب دل کھول کر عیش کرو۔ ہمیں نکالنے کے

لیے ایک نند کمار نہیں ہزاروں نند کماروں کی موت کی ضرورت ہے۔ ہزاروں نند کمار مریں گے۔ جب کہیں جا کر انگریز قوم ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو گی۔ آج ایک نند کمار کے مقابلے میں یہاں ہزاروں موہن پرشاد موجود ہیں — اور ہماری کامیابی یہی ہے کہ ہم موہن پرشادوں کی تعداد میں اضافہ کرتے جائیں — دوستو! مزے سے پئے جاؤ — مزے سے پئے جاؤ +

(وارن ہیسٹنگز نیا پیگ اُٹھا کر منہ سے لگا لیتا ہے
بارول، امپی اور لیڈی ہیسٹنگز اس کی طرف دیکھ رہے
ہیں — نیچے شور برپا ہے)

(پردہ)

رومان

کردار:

○ نسیمہ	سلیم کی بیوی
○ بتول	نسیمہ کی عزیزہ
○ عابدہ	نسیمہ کی بیٹی
○ کریم	نوکر

منظر

ایک خوبصورت کمرہ۔ دیواروں پر جا بجا رُومانی مناظر نگاہوں کو دعوت کیف و سرور دے رہے ہیں۔ فرنیچر عمدہ اور بیش قیمت ہے اور اس انداز سے رکھا گیا ہے کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی ذہن میں ایک قسم کی شاعرانہ کیفیت کا احساس جاگ اُٹھتا ہے۔ کمرے میں دو دروازے کھلتے ہیں ایک مشرقی دیوار میں ہے اور دوسرا مغربی دیوار میں۔

اس وقت شام کے چھ بجے ہیں۔ سُورج کی شفق آلود کرنیں مغربی دروازے سے کچھ دُور کھڑکی میں سے گزرتی ہوئی پیانو پر سنہری جال سا بُن کر پھیلی ہوئی ہیں۔ پیانو کے قریب نسیمہ اور بتول بیٹھی ہیں۔

نسیمہ قریب قریب تیس سال کی ایک خوبصورت عورت ہے۔ لباس ہلکے گلابی رنگ کا ہے۔ اس کے پہلو میں بتول بیٹھی ہے۔ بتول سترہ سال کی لڑکی ہے۔ چہرے سے اس قسم کی شوخی نمایاں ہے۔ جیسے کسی بات کو محض اس لیے چھپانے کی کوشش کر رہی ہے کہ دوسرا اس کے بارے میں بار بار پوچھے نسیمہ پُر شوق نظروں سے بتول کی طرف دیکھ رہی ہے اور بتول بے اختیاری کے عالم میں پیانو کے پردوں کو چھُو رہی ہے۔

مہ : (اضطراب انگیز لہجہ میں) تو پھر؟

ب : تو پھر ——؟ (مسکرا کر) تو پھر کچھ نہیں۔

یمہ : پھر کچھ نہیں —— یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟

ل : میں کیا جانوں ——!

مہ : بتاؤ بھی نا!

ل : چھوڑو بھی نا اب اس قصے کو۔

یمہ : (سر پٹکتے ہوئے) اونہوں۔

ل : (نسیمہ کی نقل اتارتے ہوئے) اونہوں —— (بے اختیار ہنس پڑتی ہے) اب کون بتائے آپ کو

مہ : تم اور کون —— کیا ہوا پھر؟

ل : وہی ہوا جو عام طور پہ ہوا کرتا ہے اور کیا ہو سکتا تھا؟

مہ : یہی تو میں پوچھتی ہوں —— کیا کہہ رہی تھیں ایک دن سکول سے گھر لوٹیں تو ٹیبل پر نیلے رنگ کا ایک لفافہ پڑا تھا۔

ل : جی ہاں —— اب آپ پوچھیں گی، پھر کیا ہوا؟

یمہ : بار بار تو پوچھ رہی ہوں۔

ل : مجبور کر ہی دیا ہے آپ نے۔

یمہ : دل میں تو گدگدی ہو رہی ہو گی —— ہے نا؟

بتول: بڑی ضدی ہیں — آپا آپ!

نسیمہ: چلو یونہی سہی۔

بتول: تو آپا! میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ لفافہ اٹھا لیا۔

نسیمہ: کیا لکھا تھا؟

بتول: کتنی بے صبر ہیں، آپ بھی۔ ناصر میاں نے بھیجا تھا، لکھا تھا —
مگر کیوں بتاؤں آپ کو۔

نسیمہ: بھئی خوب ہو تم — اچھا نہ بتاؤ۔

بتول: روٹھ گئیں، لیجئے سنئیے — بہت مختصر خط لکھا تھا — لکھا تھا

(باہر سے عابدہ کی آواز آتی ہے — امی)

نسیمہ: خدا کی پناہ! (بلند آواز سے) کیا ہے عابدہ!

(عابدہ اندر آتی ہے۔ وہ سات آٹھ سال کی لڑکی ہے)

عابدہ: امی! رضیہ کے ابا نے گڑیا بھی لے دی ہے اور گڈا بھی۔ آپ کب لے دیں گی گڑیا

نسیمہ: لے دوں گی تمہیں بھی، اب جاؤ۔

عابدہ: ضرور لے دیں گی نا — روز کہتی ہیں لے دوں گی، لے دوں گی
اب تک لے کر تو دی نہیں۔

نسیمہ: اب جا کر کھیلو کل ضرور لے دوں گی۔

عابدہ: اگر کل بھی نہ لے کر دی تو — میں رو پڑوں گی۔

مہ: رونے کا چیلنج آج ہی دے دیا۔ اچھا جاؤ۔

(عابدہ چلی جاتی ہے)

س: تو ہاں خط میں صرف تین چار سطریں تھیں: "آپ کی کئی نظمیں پڑھ چکا ہوں محسوس ہوتا ہے۔ ادب کے افق پر ایک نیا ستارہ اُبھر رہا ہے۔ رشیدہ کی وساطت سے اپنی نظمیں بھیج رہا ہوں۔ اپنی رائے لکھیے"! یہ تھا سارا خط

مہ: پھر کیا ہوا؟

ل: میں یہ خط پڑھ ہی رہی تھی کہ رشیدہ پردے سے باہر نکل آئی اور ہنسنے لگی میں نے غصے سے کہا "تمہارے بھائی کو یہ خط لکھنے کا کیا حق حاصل تھا" اور نہ جانے غصے میں کیا کچھ کہہ دیا میں نے وہ ہنستی رہی اور ایک کاپی میری گود میں پھینک کر چلی گئی! —— میں نے کاپی اٹھا لی۔ جی چاہا پھینک دوں پھر بھی نہ جانے کیوں پڑھنے لگی اور دیر تک پڑھتی رہی۔ کیونکہ نظمیں بہت اچھی تھیں —— یہ تھی ابتدا ہمارے رُومان کی۔ اس کے بعد خط و کتابت شروع ہو گئی۔ ملاقاتیں بھی ہونے لگیں اور اب تک ہو رہی ہیں!

مہ: تو آج کل محسوس کیا کر رہی ہو؟

ل: عجیب و غریب رومانی خواب دیکھتی رہتی ہوں عجیب و غریب رومانی دُنیا میں سانس لے رہی ہوں، اس دُنیا میں شفق کی رنگینیاں بکھری ہوئی ہیں کہکشاں کے چمکتے ہوئے موتیوں کی جھالریں چاروں طرف آویزاں ہیں —— اور فضاؤں میں عجیب قسم کی پُراسرار کیف و مستی پھیلی ہوئی ہے —— اُٹھتے

ہوئے نہ جانے کن اجنبی فضاؤں کو چھو لیتی ہوں۔ نہ جانے کس اُفق سے برستے ہوئے نغموں کی گونج اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتی رہتی ہوں —— کاش یہ خواب کبھی ختم نہ ہوں —— کبھی ختم نہ ہوں۔

نسیمہ: یہی میرے خواب تھے۔ بالکل یہی ——

(بتول پیانو بجانے لگتی ہے۔ نسیمہ اپنے تصورات میں غرق ہے، کریم آتا ہے)

کریم: بی بی جی!

نسیمہ: (خفا ہو کر) کہو

کریم: بے بی کا نسخہ کہاں ہے۔ کہیں نہیں ملا مجھے تو

نسیمہ: میں کیا جانوں کہاں ہے؟ یہیں کہیں پڑا ہوگا۔

کریم: صاحب تاکید کر گئے تھے کہ بے بی کے لیے ضرور دوائی لانا۔ مگر نسخہ ہی نہیں ملتا

نسیمہ: مل جائے گا۔ دفع دفان ہو جاؤ اب۔

کریم: نسخہ صبح آپ کو دیا تھا۔

نسیمہ: سخت بیزار ہو گئی ہوں اِن لوگوں سے۔ ذرا چین نہیں لینے دیتے۔

(کریم چپ چاپ سر کھجلاتا ہوا باہر نکل جاتا ہے)

بتول: لو آپا چلتی ہوں

نسیمہ: کیوں؟

بتول: سچی بات تو یہ ہے آج چار بجے کی ڈاک سے اُن کا خط آنے والا تھا۔

پہنچ گیا ہوگا، دیکھتی ہوں جاکر

نسیمہ : تو یہ بات ہے

بتول : آپا! آپ تو اچھی خاصی ذہین ہیں (مسکراکر) اچھا پھر ملاقات ہوگی

(بتول مشرقی دروازے میں سے نکل جاتی ہے۔ نسیمہ انگلیوں سے پیانو کو چھیڑتی ہے اور اُٹھ کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کا چہرہ سُرخی مائل روشنی سے چمک اُٹھتا ہے۔ وہ آنکھیں بند کرکے اپنے خوش گوار اور خواب آلود تصورات میں ڈوبی رہتی ہے — چند لمحے گزر جاتے ہیں۔ سلیم اندر آتا ہے۔ سلیم کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ ہے۔ چہرے سے گہرے تفکرات کے آثار نمایاں ہیں۔ وہ کمرے میں آکر ٹوپی کھونٹی پر لٹکا دیتا ہے۔ اپنے بالوں میں اس طرح اُنگلیاں پھیرتا ہے۔ جیسے سر میں درد محسوس ہو رہا ہو۔ نسیمہ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے۔ سلیم بھی بیوی کی مسکراہٹ کے جواب میں مسکرا پڑتا ہے)۔

نسیمہ : بڑی دیر لگا دی آج تو آپ نے؟

سلیم : روز اسی وقت آتا ہوں۔

نسیمہ : شاید مجھے محسوس ہو رہا ہے آج آپ دیر سے آئے ہیں — انتظار جو کر رہی تھی۔

سلیم : کیوں؟

نسیمہ: کیوں کیا۔ (مسکراتی ہے اور ایک خاص انداز سے شوہر کی طرف دیکھتی ہے) آپ گھر آنے کیلئے بیتاب نہیں رہتے؟

سلیم: کیوں نہیں

(کریم آتا ہے)

کریم: بی بی! رحیمن سے پوچھا ہے۔ اسے بھی خبر نہیں۔

سلیم: (کریم سے) دوا لائے بے بی کے لیے؟

کریم: جی نہیں نسخہ ہی نہیں ملا کہیں۔

سلیم: کیوں؟

نسیمہ: او ہو مل جائے گا۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو گئے ہیں۔ جاؤ کریم دوسرے کمرے میں جا کر الماری میں دیکھو۔

سلیم: آج بخار تو نہیں رہا بے بی کو۔

نسیمہ: (بے پروائی سے) نہیں۔

(کریم چلا جاتا ہے)

سلیم: عابدہ کے زخم پہ مرہم لگا دی تھی؟

نسیمہ: لگا دی ہو گی رحیمن نے۔ ان باتوں کو چھوڑیے بھی نا (سامنے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جہاں جھیل ڈل کا منظر دکھایا گیا ہے) دیکھئے وہ تصویر کیسی ہے؟

سلیم: بہت اچھی ہے

نسیمہ: آج صبح لائی تھی بازار سے (لمبا سانس لے کر) دیکھئے تو آج شام کس قدر حسین ہے۔

سلیم: (کھڑکی سے باہر دیکھ کر) ہاں اچھی ہے۔

نسیمہ: ابھی ابھی میں کھڑکی میں سے دیکھ رہی تھی۔ سامنے درختوں کی جھومتی ہوئی ٹہنیوں میں سورج کی شفق آلود کرنیں جھول رہی تھیں اس وقت مجھے وہ زمانہ یاد آگیا۔ جب میں اور آپ گھنٹوں بالکنی میں کھڑے باتیں کیا کرتے تھے۔ یاد ہے وہ زمانہ آپ کو؟

سلیم: وہ زمانہ کیونکر بھول سکتا ہوں — مگر وہ کھڑکی کیوں کھول رکھی ہے۔ بے بی کو زکام ہے۔ ہوا لگ جانے کا اندیشہ ہے۔

نسیمہ: بے بی یہاں سے کہاں؟

سلیم: تو کہاں ہے؟

نسیمہ: رحیمن باہر دالان میں لے گئی ہے

سلیم: زکام کی حالت میں اسے باہر بھیج دیا ہے۔

نسیمہ: معمولی بات ہی تو ہے۔

سلیم: معمولی بات کہاں ہے۔ تمام رات کھانستی رہی ہے بیچاری

نسیمہ: (اسی تصویر کو دیکھ کر) دوکاندار کے پاس اسی قسم کی ایک اور تصویر بھی

ہے کل چلیں گے نا آپ میرے ساتھ۔

سلیم: فرصت نہیں ملتی، کوشش کروں گا۔

نسیمہ: آپ کو جانا ہی پڑے گا۔

سلیم: اچھا چلا جاؤں گا بابا!

نسیمہ: (کچھ سوچ کر) یاد ہے نا ہماری پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟

سلیم: جھیل ڈل پر ——

نسیمہ: جھیل ڈل کے کنارے۔ میں دور ایک کشتی کو دیکھ رہی تھی۔ جو پانی کی شفّاف سطح پر تیرتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی تھی —— اچانک آپ آ گئے اور ابّا جان نے آپ کو پہچان لیا۔

سلیم: اُن کے عزیز دوست کا بیٹا جو ہوں۔

نسیمہ: ایک ایک بات یاد ہے اُس وقت کی۔

سلیم: اس دن میں کافی دیر آپ لوگوں کے ساتھ رہا تھا۔

نسیمہ: یاد ہے آپ نے جاتے ہوتے ابّا جان سے کیا کہا تھا؟

سلیم: کچھ یاد ہے کچھ بھول گیا ہوں

نسیمہ: (روٹھ کر) مجھے بڑا غصہ آتا ہے۔ جب آپ کہتے ہیں کچھ یاد ہے، کچھ بھول گیا ہوں!

سلیم: بھئی اب صرف غمِ جاناں ہی نہیں، غمِ دوراں بھی ہے۔ سارا دن کاروبار

میں سر کھپانا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے دماغ میں بے شمار چیزیں جمع ہو گئی ہیں۔

نسیمہ : تو یوں کہیے پچھلی سب باتیں کاروبار میں دب گئی ہیں۔

سلیم : تمہارا خیال ہے مجھے ہر وقت اسی زمانے کی یاد میں محو رہنا چاہیے

نسیمہ : یہ میں نے کب کہا ہے؟

سلیم : تو پھر کیا کہا ہے؟ —— پھر کیا کہنا چاہتی ہو؟

نسیمہ : یہی کہ آپ بدلتے جا رہے ہیں۔ پہلے کچھ اور تھے اب کچھ اور ہیں۔

سلیم : مطلب یہ کہ مجھے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر شفق کو دیکھنا چاہیے۔ رومانی شعر پڑھنے چاہئیں اور ذہن سے پچھلی ایک ایک بات کرید کر نکالنی چاہیے۔

نسیمہ : اب کاروباری آدمی جو بن گئے۔ آپ ایسی باتیں نہ کہیں گے تو اور کون کہے گا؟

سلیم : نسیمہ! میں ایک شوہر اور ایک باپ ہوں۔ کسی دیسی فلم کا ہیرو نہیں ہوں جسے گانے اور عشق کرنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔

نسیمہ : یہ تو محض بہانہ سازی ہے۔ صاف کیوں نہیں کہہ دیتے مجھے اب تمہاری ذات سے وہ دل چسپی نہیں ہے جو شادی سے پہلے تھی!

سلیم : یہ بات ہرگز نہیں ہے مجھے تمہاری ذات سے وہی دل چسپی ہے مگر اب زندگی میں رومان کے علاوہ اور بھی بے شمار مسائل ہیں۔ ہمیں ان مسائل سے دل چسپی لینی چاہیے۔ ورنہ زندگی میں صرف رومانی خواب ہی باقی رہ جائیں گے

نسیمہ : بیوی سے دل چسپی نہ رہی تو کہہ دیا زندگی میں اور بھی بے شمار مسائل ہیں۔

سلیم: اب میں نہیں کیوں کر بتاؤں ہماری زندگی کئی حصّوں میں بٹ چکی ہے

نسیمہ: یاد ہے شادی سے پہلے کیا کہا کرتے تھے "نسیمہ! ہم اپنی دُنیا کو ایک ایسی دُنیا بنا دیں گے جہاں رُومان ہی رُومان ہوگا۔ جہاں مسرّت ہی مسرّت ہوگی" —— خیر مجھے آپ سے شکوہ نہیں ہے۔

سلیم: شکوہ تو مجھے کرنا چاہیے۔ کیا ماں ہونے کی حیثیت سے تمہارا فرض نہیں کہ بچّوں کی صحت کا خیال رکھو —— گھر کی ذمّہ داریوں کا پوری طرح احساس کرو۔ مگر تم نے تو اپنا فرض یہی سمجھ لیا ہے کہ بازار سے نت نئی تصویریں لاتی رہو۔ دروازے پر رنگ برنگ کے پردے لٹکاتی رہو۔ صبح و شام باغوں میں گھومتی پھرو۔ بے بی کئی دن سے بیمار ہے۔ تم نے ایک دن بھی دوا منگوانے کی کوشش نہیں کی۔ عابدہ کی ٹانگ پر زخم ہے۔ مگر تمہیں اس کی پروا ہی نہیں۔ صبح کریم نے میرے سامنے تمہیں نسخہ دیا تھا —— تم نے نہ جانے اسے کہاں پھینک دیا ہے۔ اب وہ بے چارہ پریشان پھر رہا ہے۔ کیا یہ کام میرے کرنے کے ہیں؟

نسیمہ: اب میری توبہ جو پچھلی باتوں کا ذکر کروں! مجھے معلوم نہ تھا۔ میرے خواب اتنی جلدی جل کر بھسم ہو جائیں گے۔ کاش یہ خواب دیکھے ہی نہ ہوتے۔

سلیم: سمجھ میں نہیں آتا تمہیں کیوں کر سمجھاؤں؟ سچی بات کہہ دوں تو تمہارے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔

نسیمہ: حقیقت بینی تو آپ پر ختم ہے (رونے لگتی ہے) میں بالکل بے پروا عورت ہوں مجھے نہ گھر کا خیال ہے نہ بچوں کا احساس ہے۔

سلیم: مجھے افسوس ہے، ایسی وہ تلخ باتیں کہہ دیں مگر تمہیں بھی تو اپنی ذمہ داریوں کا خیال کرنا چاہیے نا۔

نسیمہ: ذرا لیمپ کا شیڈ بدل دوں تو ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ پچھلی باتوں کا ذکر کروں تو اور فلسفے لے بیٹھتے ہیں اگر آپ کو اتنی جلدی بدل جانا تھا تو پہلے بتا دیا ہوتا تاکہ میں اپنی امیدوں کا گلا گھونٹ کر اس گھر میں قدم رکھتی۔

سلیم: لیکن نسیمہ! مجھے رات کو کام کرنا ہوتا ہے اور تم لیمپ کے شیڈ بدل کر فضا کو رُومانی بنانا چاہتی ہو۔ کام کروں یا تمہاری رُومانی فضا میں کھو جاؤں؟

نسیمہ: یہی تو میں کہتی ہوں، آپ میری ہر بات سے بیزار ہو چکے ہیں۔

سلیم: بیزار کون کمبخت ہے، نہ سوچتی ہو نہ سمجھتی ہو یونہی الزام لگانے جا رہی ہو!

نسیمہ: مہربانی کر کے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔ میں اپنی امیدوں کو اپنے سینے ہی میں دفن کر لوں گی اپنی آرزوؤں کا اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دوں گی۔ یہی چاہتے ہیں نا آپ!

سلیم: نسیمہ! ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ اب ہم جس منزل پر ہیں۔ وہاں نئی ذمہ داریاں ہیں، نئے فرائض ہیں۔ ماضی واپس نہیں آ سکتا۔ اگر ہم اُسے واپس لانے کی کوشش کریں گے تو گھر کا سارا نظام تباہ ہو جائے گا۔

نسیمہ: جی میں ماضی واپس لانے کی کوشش نہیں کرتی۔ یہ عورت کی بدقسمتی ہے کہ وہ ہمیشہ خواب ہی دیکھا کرتی ہے اور یہ خواب کبھی پورے نہیں ہوتے

سلیم: نسیمہ! تم اپنی ضد سے گھر کو برباد کر کے ہی دم لوگی!

نسیمہ: مہربانی کر کے چلے جائیے۔

سلیم: اور کیا کروں گا؟

(سلیم غصے میں تیزی سے باہر نکل جاتا ہے۔ اس وقت کمرے میں اندھیرا پھیل رہا ہے۔ نسیمہ کوچ پر گر کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیتی ہے اور سسکیاں لینے لگتی ہے   سٹیج کا منظر بدلتا ہے   جب دوبارہ پردہ اُٹھتا ہے تو ہم نسیمہ کو پیانو کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں۔ چہرہ پوڈر میں لپٹا ہوا ہے۔ ہونٹوں پر سُرخی ہے۔ وہ پیانو بجا رہی ہے۔ اس وقت اُس کی زبان پر غالب کا یہ شعر ہے ؎

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن   بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

سلیم آتا ہے اس کے ایک ہاتھ میں کاپی ہے اور دوسرے میں پنسل۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھتے ہیں۔ سلیم کوچ پر اس کے پہلو میں بیٹھ جاتا ہے)

نسیمہ: مکمل ہو گئی نظم؟

سلیم: کچھ ہو گئی ہے۔ اتنی رومانی نظم کہی ہے کہ پڑھنے والے پڑھ کر حیرت میں ڈوب جائیں گے۔

نسیمہ: سنایئے۔

سلیم: ابھی صرف تین بند لکھے ہیں — سنو!

کس قدر یہ حسین دنیا ہے
یہ ہے دنیا شباب کی دنیا
کہکشاں، ماہتاب کی دنیا
کس قدر یہ حسین دنیا ہے
چاندنی ہے فضاؤں میں رقصاں
میٹھے نغمے ہواؤں میں رقصاں
کس قدر یہ حسین دنیا ہے
چھا رہی ہے شفق کی رنگینی
تیرتی پھر رہی ہے مستی سی
کس قدر یہ حسین دنیا ہے

نسیمہ: بہت خوب!

سلیم: ابھی چار پانچ بند اور لکھوں گا۔

نسیمہ: بتول کہتی تھی — اس کا ماموں بہت اچھے شعر کہتا ہے۔ یہ نظم دیکھے تو معلوم ہو جائے اُسے شعر کیسے کہتے ہیں۔

سلیم: سچ؟

نسیمہ : ہاں تو ـــــ سلیم (جذباتی انداز میں) آخر ہم اپنے خواب واپس لے ہی آئے

سلیم : میں سمجھتا تھا۔ ہمارا ماضی واپس نہیں آ سکتا۔ مگر یہ میرا خوفناک وہم تھا آج وہی زمانہ پھر لوٹ آیا ہے۔ وہی زندگی کا رومان پرور زمانہ۔

نسیمہ : آپ نے اپنی نظم میں جس دُنیا کا ذکر کیا ہے۔ وہی ہماری دُنیا ہے محسوس ہوتا ہے جیسے ایک عجیب و غریب رومانی دُنیا میں سانس لے رہی ہوں اس دُنیا میں شفق کی رنگینیاں بکھری ہوئی ہیں۔ کہکشاں کے بکھرے ہوئے موتیوں کی جھالریں چاروں طرف آویزاں ہیں اور فضاؤں میں ایک عجیب قسم کی پُراسرار کیف و مستی پھیلی ہوئی ہے۔ دُور اُڑتے ہوئے نہ جانے کن اجنبی فضاؤں کو چھو لیتی ہوں۔ نہ جانے کس اُفق سے برستے ہوئے نغموں کی گونج اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتی رہتی ہوں ـــــ کاش یہ خواب کبھی ختم نہ ہوں ـــــ کبھی ختم نہ ہوں۔

سلیم : میں بھی یہی خواب دیکھا کرتا ہوں۔

نسیمہ : (سلیم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر) مجھے بتُول کی رومانی زندگی پر رشک آتا تھا۔ مگر آج میں اپنے آپ کو اس سے زیادہ خوش قسمت سمجھتی ہوں۔

سلیم : ہماری محبّت نے دُنیا کو جنّت بنا دیا ہے۔

نسیمہ : واقعی جنّت ہے یہ دُنیا۔

سلیم : ہاں نسیمہ پیاری! آج شام کا پروگرام کیا ہے؟

سیمہ: اوہ — چاندنی رات — آج تو دریا کی سیر خوب رہے گی۔

لیم: عجیب لطف آئے گا۔

سیمہ: ابھی شام ہونے میں کچھ دیر باقی ہے۔ اگر آپ کو فرصت ہو تو ذرا بازار چلیں۔ دروازوں کے پردے بدل دینا چاہتی ہوں اور وہاں کل بڑی خوبصورت تصویریں دیکھی تھیں۔ آپ بھی ساتھ تھے نا؟

لیم: وہ تصویریں — کیا بات ہے۔ بہت اعلیٰ تصویریں ہیں۔

سیمہ: تو خرید لاتے ہیں — آپ کو فرصت تو ہے نا؟

لیم: فرصت نہ ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا — ہر وقت فرصت ہی فرصت ہے۔

سیمہ: تو میں ساڑھی بھی بدل لوں — اور ہاں چند چیزیں اور بھی خریدنی ہیں۔ بک سیلر نے نئے رومانی ناولوں کی فہرست بھی بھیجی ہے۔ ناولوں کے علاوہ ایک دو ساڑھیاں بھی لے لیں گے۔ برُٹل نے ٹی پر بلا رکھا ہے۔

لیم: بہتر۔

(نسیمہ شوہر کی طرف مسکرا کر دیکھتی ہے اور دوسرے کمرے کی طرف جانے لگتی ہے — کریم دروازے پہ آتا ہے —)

ریم: ڈاکٹر کا نوکر بل لے کر آیا ہے صاحب!

سیمہ: میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔

سلیم: بہتر

(نسیمہ دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے)

کریم: کیا کہوں؟

سلیم: بھئی کہہ دو ـــ ہاں ٹال دو کسی نہ کسی طرح

کریم: چوتھی مرتبہ آیا ہے اور یہ پچھلے مہینے کا بل ہے۔

سلیم: کتنے پیسے ہیں؟

کریم: اُنتیس روپے چار آنے

سلیم: اچھا ـــ (جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے) کافی رقم بنا رکھی ہے ڈاکٹر صاحب نے

کریم: اور ـــ صاحب! بہو نے پیسوں کے لیے خط لکھا ہے۔ نور دین بیمار ہے آپ جانتے ہیں آپ نے پچھلے مہینے کی تنخواہ بھی نہیں دی۔

سلیم: تو اب کیا چاہتے ہو؟

کریم: تنخواہ دے دیجئے۔ بہو کو علاج معالجے کے لیے پیسے بھیج دوں ـــ مجھے بھی کپڑے بنانے ہیں۔

(سلیم جیب سے نوٹ نکالتا ہے)

سلیم: یہ لو چالیس روپے ہیں۔ ڈاکٹر کا بل بھی چکا دو اور تم بھی لے لو۔

کریم: بڑی مشکل ہے صاحب

سلیم: اس وقت تو جاؤ ـــ کل پرسوں بقیہ رقم لے لینا

(کریم سر جھکائے نوٹ لے کر کمرے سے نکل جاتا ہے۔ نسیمہ آتی
ہے۔ نئی پیازی رنگ کی ساڑھی اس کے زیب تن ہے)

مہ : کیا بات ہے ڈاکٹر کا نوکر بل لینے آیا تھا؟

یم : لے گیا ہے۔

یمہ : (آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر) دیکھئے تو اچھی معلوم ہوتی ہے ساڑھی

یم : یہ ساڑھی پہن کر تمہارا رنگ اور بھی نکھر گیا ہے

مہ : واقعی؟

یم : اس وقت تو تم بالکل ایک مصور کا شاہکار معلوم ہوتی ہو

(کریم آتا ہے)

یم : دودھ والا آیا ہے

یم : یہ لوگ نہ جانے کیوں رنگ میں بھنگ ڈال رہے ہیں

مہ : دے دیجئے پیسے۔

م : بہتر! (جیب میں ہاتھ ڈال کر دس دس کے دو نوٹ کریم کے ہاتھوں میں دے
دیتا ہے۔ کریم نوٹ لے کر جانے لگتا ہے مگر دروازے پر جا کر رک جاتا ہے)

یم : اور سبزی والے کا بل سرکار! اس کا آدمی بھی آیا ہے۔

م : لے لو اس کے روپے بھی (جیب سے ایک نوٹ نکال کر کریم کے ہاتھ میں
دے دیتا ہے کریم کمرے سے نکل جاتا ہے)

نسیمہ: آپ تیار ہیں

سلیم: بالکل تیار ہوں (عابدہ آتی ہے۔ کپڑے میلے کچیلے ہیں۔ بال چہرے پر بکھرے ہوئے ہیں)

نسیمہ: ہائے یہ عابدہ نے کیا صورت بنا رکھی ہے۔ رحیمن نے اس کے کپڑے بھی نہیں بدلوائے۔

سلیم: رحیمن تو پرسوں سے چلی گئی ہے

نسیمہ: کیوں؟

سلیم: دو مہینے کی تنخواہ نہیں ملی تھی۔ کریم بھی جا رہا تھا۔ ایک مہینے کی تنخواہ دے کر روکا ہے اُسے۔

نسیمہ: آپ نے رحیمن کو تنخواہ کیوں نہ دی؟

سلیم: تنخواہ تو دے دی تھی۔

نسیمہ: تو پھر کیوں چلی گئی۔

سلیم: اس نے جانا ہی مناسب سمجھا ۔۔۔ شاید سمجھا ہو گا، مالک تو سارا دن گھر میں بیٹھا رہتا ہے۔ کاروبار تباہ ہو رہا ہے۔ آئندہ مجھے کہاں سے تنخواہ ملے گی۔ چلی گئی یہ سوچ کر۔

نسیمہ: عابدہ ۔۔۔ اوہ کتنی بھیانک شکل بن گئی ہے میری بیٹی کی

(عابدہ آتی ہے۔ نسیمہ اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے)

یمہ: ہائے اس کا بدن تو گرم ہے۔

لیم: بخار وار ہوگا — چھوٹی بچی بھی رات سے اوندھے منہ پڑی ہے

سیمہ: بڑی نمک حرام نکلی ہے یہ رحیمن (عابدہ کو پلنگ پہ لٹا دیتی ہے)

لیم: شام ہو رہی ہے شاپنگ کے لیے نہیں چلنا۔ مگر میری جیب میں اس وقت ایک پیسہ بھی نہیں۔

نسیمہ: کیوں؟

سلیم: کیوں؟ — اس کا کیا جواب دوں۔ سارا دن تو گھر میں رہتا ہوں — کاروبار کی طرف توجہ ہی نہیں کر سکا۔ مجھے تو ڈر ہے آج رات کہیں فاقہ ہی نہ کرنا پڑے

نسیمہ: آپ نے کبھی اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

سلیم: میں نے سوچا یہ سب مستقبل کی باتیں ہیں اور ہم دونوں اپنے ماضی کے گہوارے میں جھول رہے تھے۔

عابدہ: ٹانگ میں بڑا درد ہے امی

(کریم بے بی کو گود میں اٹھائے لاتا ہے)

کریم: بی بی! اسے کیا ہو گیا ہے، بیہوش ہے۔

نسیمہ: (سہمی ہوئی آواز میں) بیہوش ہے (بھاگ کر ادھر جاتی ہے) ہائے اسے کیا ہو گیا ہے۔ بدن سرد ہے، ڈاکٹر کو بلائیے۔

سلیم: مگر ڈاکٹر فیس لیے بغیر آئے گا نہیں۔

نسیمہ: آپ بلائیے تو (بے بی کو اپنی گود میں اٹھا لیتی ہے اور نبض دیکھتی ہے)
نبض بہت آہستہ آہستہ چل رہی ہے۔ خدا کے لیے جلدی جائیے ——
جلدی کیجیے ——

(عابدہ رونے لگتی ہے)

کیا ہوا عابدہ —— ! عابدہ !!

(پردہ گرنے لگتا ہے۔ نسیمہ کی آواز عابدہ عابدہ کہتی ہوئی آ رہی ہے جب دوبارہ پردہ اٹھتا ہے تو ہم نسیمہ کو اسی لباس اور اسی حالت میں دیکھتے ہیں جس لباس اور حالت میں وہ پہلے منظر میں دکھائی گئی ہے نسیمہ چونک کر آنکھیں کھول دیتی ہے۔ سلیم اس کے چہرے پر جھکا ہوا ہے)

سلیم: نسیمہ!

نسیمہ: (چاروں طرف وحشیانہ انداز میں دیکھتے ہوئے) اوہ!

سلیم: معلوم ہوتا ہے سوتے میں کوئی وحشت انگیز خواب دیکھا ہے تم نے۔

نسیمہ: بے بی کہاں ہے؟

سلیم: اسے کریم ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا، آ رہا ہوگا۔ تم سو گئی تھیں۔

نسیمہ: اور عابدہ؟

سلیم: وہ باہر گڑیا سے کھیل رہی ہے۔ بتول کے گھر سے گڑیا لے آئی ہے۔

(عابدہ گڑیا لیے آتی ہے)

بدہ : امی! نوّل باجی نے دے دی ہے کتنی خوبصورت ہے۔ رضیہ کے گڈے سے بیاہ کروں گی۔

م : اچھا جاؤ۔ باہر جا کر کھیلو۔ (عابدہ جانے لگتی ہے)
تم اس قدر پریشان کیوں ہو نسیمہ!

مہ : کچھ نہیں۔

م : نسیمہ! میں تم سے ناراض ہو کر گیا   تو راہ میں یہ سوچ کر بڑی تکلیف ہوئی کہ خواہ مخواہ شکر رنجی پیدا کر دی۔ میں نے اپنے دل میں عہد کر لیا ہے کہ اب کبھی تمہارا دل نہیں توڑوں گا۔ ہم اپنے ماضی کو واپس لے آئیں گے۔

مہ : نہیں مجھے ماضی نہیں چاہیے۔ ماضی کبھی واپس نہیں آسکتا

لیم : (حیرت سے) نسیمہ!

یمہ : ابھی تک کریم بے بی کو واپس لے کر کیوں نہیں آیا۔ دیکھئے تو۔

(نسیمہ اور سلیم دونوں ایک ساتھ کمرہ سے باہر نکلنے لگتے ہیں)

(پردہ)

سیکرٹری

○ پروفیسر
○ محمود نیازی ------ ایک نوجوان
○ عبدالجبار ------ ایک منطقی
○ رضیہ ------ پروفیسر کی بیٹی
○ نوکر

پہلا منظر

پروفیسر کا خاص کمرہ:

چاروں طرف الماریوں میں کتابیں بڑے قرینے سے پڑی ہیں۔ یہ کمرہ ایک اچھی خاصی لائبریری ہے۔ پروفیسر کو فلسفے سے خاص شغف ہے۔ اسلئے اس لائبریری میں زیادہ تعداد اُن کتابوں کی ہے جو فلسفے کی مختلف شاخوں سے متعلق ہیں ہر الماری کی پیشانی پہ کسی نہ کسی بڑے فلسفی کا نام بڑے خوشنما حروف میں لکھا ہوا ہے۔ اس وقت پروفیسر کرسی پہ بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے ایک ضخیم کتاب کھلی ہوئی ہے جس کے ایک صفحے پر اُن کی نظریں جمی ہیں۔ دو چار لمحے گذر جاتے ہیں۔ پروفیسر گھنٹی بجاتے ہیں نوکر آتا ہے اور ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہے۔ پروفیسر کی نگاہیں بدستور صفحے پر جمی ہیں)

پروفیسر: کل میں نے جو کہا تھا وہ یاد ہے؟

نوکر: جی ہاں۔ آج بارہ بجے کچھ لوگ انٹرڈو کے لیے آئیں گے

پروفیسر: انٹرڈو کیا ہوا۔ انٹرویو کہو۔ ایک سال تک نوکری کرنے کے باوجود صحیح لفظ نہیں کہہ سکتے۔ سوچ کر بات کہا کرو۔

نوکر: جی۔ ان سب کے نام لکھ کر دے دوں آپ کو؟ (جانے لگتا ہے)

وفیسر: ...... کتنی بُری بات ہے، صبر کے ساتھ بات بھی نہیں سُن سکتے۔

کر: فرمایئے جناب۔

وفیسر: اِن سب کے نام لکھ کر دے دینا اور پھر باری باری سب کو بُلانا، سُنا! اب تم جا سکتے ہو۔ ہاں اب وقت کیا ہُوا ہے؟

کر: ساڑھے گیارہ بجنے والے ہیں۔

وفیسر: اچھا جاؤ۔

(نوکر چلا جاتا ہے۔ پروفیسر مطالعے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ چند لمحوں کے بعد چق اُٹھا کر ایک نوجوان آتا ہے اور پروفیسر کے دائیں طرف کھڑا ہو جاتا ہے۔ پروفیسر اُدھر دیکھتے ہیں اور ان کی پیشانی پر شکنیں پڑ جاتی ہیں)

نوجوان: آداب عرض

پروفیسر: کون ہیں آپ؟

نوجوان: یہ اشتہار — جیب میں سے اخبار نکال کر اسے کھولنے لگتا ہے۔

پروفیسر: آپ اُمیدوار ہیں؟

نوجوان: آپ نے بالکل درست سمجھا!

پروفیسر: (حقارت سے) ہونہہ۔

نوجوان: جناب؟

پروفیسر: باہر تشریف لے جائیے۔ میرا نوکر آپ کا نام لکھ لے گا اور دوسرے امیدواروں کے ساتھ مجھے آپ کا اسمِ شریف بھی معلوم ہو جائے گا

نوجوان: میرا نام اب بھی آپ کو معلوم ہو سکتا ہے۔ خاکسار کو محمود کہتے ہیں ـــــ محمود نیازی!

پروفیسر: انٹرویو بارہ بجے ہو گا

نوجوان: اب تو میں آ چکا ہوں۔

پروفیسر: آپ جس طرح آئے ہیں جا بھی سکتے ہیں۔

نوجوان: یہ مشکل تو نہیں مگر ذرا خیال کیجیے نا بارہ بجنے میں کم از کم آدھ گھنٹہ تو باقی ہو گا۔ اس اثنا میں مجھے کوٹھی کے باہر گھومنا ہو گا۔ خیر اس میں بھی کوئی حرج نہیں مگر مصیبت تو یہ ہے۔ آپ کی کوٹھی کے گرد کوئی باغ بھی تو نہیں ورنہ رنگ برنگ کے پھول ہی دیکھتا رہتا یا کسی درخت کے نیچے گھاس پر لیٹ جاتا۔ میں درست عرض کر رہا ہوں نا؟

پروفیسر: دوسرے کمرے میں چلے جائیے مگر دیکھیے وہاں میز پر میرے لکھنے پڑھنے کے کاغذ پڑے ہیں۔ انہیں چھیڑیے گا نہیں۔

نوجوان: معاف کیجیے۔ میں بد تمیز نہیں ہوں۔

پروفیسر: (خوش ہو کر) بہت اچھی بات ہے۔ پرسوں چند نوجوان انٹرویو کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے کاغذوں کی ترتیب ہی بگاڑ دی تھی۔ سمجھ میں نہیں

آتا ہمارے ملک کے نوجوان صبر کے ساتھ ایک جگہ بیٹھ کیوں نہیں سکتے؟

نوجوان: آپ کی نئی کتابیں پڑھیں گے تو یقیناً ان میں صبر کا مادہ پیدا ہو جائے گا

پروفیسر: آپ کو میری نگارشات سے دلچسپی ہے؟

وجوان: مجھے آپ کی نگارشات سے زیادہ آپ سے گہری دلچسپی ہے

پروفیسر: خوب؟

وجوان: تو کیا میں سمجھ لوں میرے محترم بزرگ نے مجھے اپنے سایۂ محبت میں لے لیا ہے؟

وفیسر: دیکھئے صاحب میں اپنے اصول پر سختی سے پابند ہوں۔ اس وقت آپ جا سکتے ہیں۔

جوان: اصول کی پابندی میں سمجھتا ہوں یہ انسان کی کمزور ذہنیت کا ایک خاص پہلو ہے ——— جب ہماری ہمت کسی خارجی یا داخلی رکاوٹ کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے تو ہم اپنے آپ کو دھوکا دے کر یہ سمجھنے لگتے ہیں یہ اصول کی پابندی ہے۔ فطرت آزاد کسی قسم کی پابندی برداشت نہیں کر سکتی۔

وفیسر: اوہو تمہارے نظریات ابھی بہت کچے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تم نے فلسفے کا مطالعہ سنجیدگی کے ساتھ نہیں کیا۔ آپ جا سکتے ہیں۔ مجھے آپ جیسے ناپختہ فکر نوجوانوں کی ضرورت نہیں ہے

نوجوان: میں نے فلسفے کی کتابیں تو نہیں پڑھیں مگر انسانی فطرت کا مطالعہ ضرور کیا ہے!

پروفیسر: تم نے کسی چیز پر بھی غور نہیں کیا۔ جب تک فلسفے کی مختلف شاخوں پر صبر اور سنجیدگی کے ساتھ غور نہ کیا جائے انسانی فطرت کو سمجھنا قطعاً ناممکن ہے۔ میں نے کہہ دیا نا مجھے آپ کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو اپنا سیکرٹری نہیں بنا سکتا۔

نوجوان: لیکن پروفیسر صاحب! کم از کم مجھ سے یہ تو پوچھ لیجیے کہ میں کن صلاحیتوں کا مالک ہوں۔

پروفیسر: ممکن ہے آپ میں گوناگوں صلاحیتیں ہوں لیکن جو صلاحیتیں میرے سیکرٹری میں ہونی چاہئیں وہ آپ میں مفقود ہیں

نوجوان: یہ آپ کیوں کر کہہ سکتے ہیں۔ پہلے مجھ سے یہ تو دریافت کیا ہوتا کہ میں نے کہاں تک تعلیم پائی ہے۔ میری ذہنی اہلیت کس درجے کی ہے؟

پروفیسر: ذہنی اہلیت؟

نوجوان: میرا مطلب ہے جہاں تک آپ کے علمی مشاغل سے تعاون کا تعلق ہے میں کہاں تک آپ کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہوں۔

پروفیسر: میں جانتا ہوں، آپ میرے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکتے۔

نوجوان: معاف کیجئے۔ یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ میں اپنی صلاحیتوں کا جائزہ لے

کر ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

پروفیسر: کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے کانٹ کے فلسفیانہ نظریات کا مطالعہ کیا ہے۔

نوجوان: کانٹ — کانٹ۔ بات یہ ہے پروفیسر صاحب میں ابھی اتنا جانتا ہوں کہ یہ شخص ایک جرمن فلسفی تھا۔

پروفیسر: اگر تم نے کانٹ کا مطالعہ کیا ہوتا تو تم بارہ بجے سے ایک منٹ بھی پہلے یہاں نہ آتے۔ تمہیں معلوم ہے یہ فلسفی جب گھر سے نکلتا تھا، تو لوگ اپنی گھڑیاں ٹھیک کیا کرتے تھے۔ سو جس شخص نے کانٹ ہی کا مطالعہ نہیں کیا۔ اسے میں کیوں کر اپنا سیکرٹری بنا سکتا ہوں۔ افسوس میں آپ سے مایوس ہوں۔

نوجوان: مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں کانٹ کا مطالعہ نہیں کروں گا

پروفیسر: جب مطالعہ مکمل ہو جائے تو میرے پاس آئیے۔ کانٹ کے متعلق گفتگو کریں گے۔

نوجوان: تو میں سیکرٹری نہیں بن سکتا؟

پروفیسر: ہم دوست بن سکتے ہیں۔

نوجوان: پروفیسر صاحب سوچئے آپ کے انکار سے میرا کیا حال ہو گا۔ میرے ذہن کے اُفق پر مایوسی کا کثیف بادل رینگنے لگا ہے اور میری زندگی کی

وسعتوں میں نا امیدی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا رہا ہے۔ آپ کے ہونٹوں سے نکلا ہوا ایک لفظ اس سارے اندھیرے کو نگل سکتا ہے۔ مایوسی کی اس تمام تاریکی کو دور کر سکتا ہے

پروفیسر: معلوم ہوتا ہے تمہیں شاعری کا شوق ہے۔

نوجوان: میں شاعر ہوں۔ میری نظموں کا پہلا مجموعہ عنقریب بازار میں آنے والا ہے

پروفیسر: (بے رخی سے) آپ جا سکتے ہیں۔

نوجوان: پروفیسر صاحب! خدا کے لیے یہ نہ کہئے۔

پروفیسر: میرے عزیز! میرے ہونے والے سیکرٹری میں جن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے وہ افسوس آپ میں موجود نہیں ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ میرے سیکرٹری کو وقت کا سختی سے پابند ہونا چاہیے۔ مگر آپ کو اس کا خیال تک نہیں ہے۔ امیدواروں کو پورے بارہ بجے بلایا تھا۔ لیکن آپ (کلائی کی گھڑی دیکھ کر) گیارہ بج کر بتیس منٹ پر آ دھمکے اور میرے نوکر کا بھی انتظار نہیں کیا۔ چق اٹھائی اور اندر آ گئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرے سیکرٹری کے لیے ضروری ہے کہ وہ فلسفے کا طالب علم ہو مگر آپ گفتگو کے وقت فلسفیانہ انداز اختیار کرنے کی بجائے تشبیہات و استعارات کا سہارا لینے کے عادی ہیں۔ غضب خدا کا میں گذشتہ

سات برس سے کانٹ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ مگر آپ کو میرے اس محبوب فلسفی کے متعلق ابتدائی معلومات بھی حاصل نہیں ہیں۔ سوچئے میں آپ کو کیوں کر سیکرٹری بنا سکتا ہوں؟ میں کانٹ پر ایک ضخیم کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے آپ میری مدد نہیں کر سکیں گے۔

جوان : یقیناً کر سکوں گا۔ آپ جو کچھ لکھائیں گے۔ اُسے بہت خوش نما طریقے سے لکھ سکوں گا۔

پروفیسر : آپ ریسرچ میں کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ آپنے کانٹ کو پڑھا ہی نہیں ہے تو مدد کیا کر سکیں گے؟

جوان : میں آج ہی سے اس کا مطالعہ شروع کر دوں گا۔ روز آپ سے کتابیں لے جایا کروں گا اور گھر میں بڑے شوق سے مطالعہ کروں گا۔

وفیسر : میں کتابیں نہیں دیا کرتا۔ بہت سے طالب علم کتابیں لے جاتے ہیں لیکن واپس نہیں کرتے اور پھر انہیں سلیقے سے کتابوں کے مطالعے کا شوق بھی تو نہیں ہے۔ صفحوں پر جا بجا دھبے پڑ جاتے ہیں۔ جلد خراب ہو جاتی ہے

جوان : میں وعدہ کرتا ہوں۔ جب بھی آپ کی دی ہوئی کتاب کا مطالعہ کروں گا تو سب سے پہلے صابن سے ایک مرتبہ نہیں بلکہ تین مرتبہ ہاتھ دھو لیا کروں گا۔

فیسر : میں نے ایک دفعہ کہہ دیا۔ میں آپ سے مایوس ہوں۔

وجوان: میں مایوس نہیں ہوں۔ میں مایوس نہیں ہو سکتا۔ کم از کم فی الحال کوئی
ایسی وجہ نظر نہیں آتی کہ مایوس ہو جاؤں۔

پروفیسر: آپ نہ ہوں۔ میں تو ہوں

نوجوان: آپ جن باتوں کی وجہ سے مایوس ہیں۔ میں ان کی تشریح کیے دیتا ہوں
آپ کا اعتراض ہے کہ میں وقت سے پہلے کیوں آ گیا۔ جناب یقین کیجیے
مجھ میں اور دوسرے اُمیدواروں میں فرق ہے اور جب فرق ہوا تو انٹرویو
کے اوقات میں بھی فرق ہونا چاہیے۔ یہ ایک شاعرانہ نہیں منطقیانہ دلیل ہے
دوسری بات یہ ہے کہ میں نے نوکر کا انتظار کیوں نہ کیا کہ وہ میری آمد کے
بارے میں اطلاع دے دے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے آپ کا
نوکر میری بات نہ مانتا۔ اس لیے میں نے اُس کو درمیان میں لانے کی
ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ تیسری بات یہ ہے کہ میں چق اُٹھا کر کیوں اندر
آ گیا۔ تو قبلہ میں بغیر چق اُٹھائے کیوں کر اندر آ سکتا تھا؟ چق میرے اور
آپ کے درمیان حائل تھی۔ اُسے راہ سے ہٹائے بغیر میں آپ کی خدمت
میں حاضر نہیں ہو سکتا تھا۔ اب رہ گیا کانٹ تو آج سے یہ فلسفی میرا محبوب
مُصنّف ہے۔ یہ تو وہ باتیں تھیں جن کا آپ کے اعتراضات سے تعلق ہے
اب اجازت دیں تو اپنی ذات کے متعلق عرض کچھ کر دوں۔ میں نے فرانس،
جرمنی اور روس کے ادبیات کا بڑے شوق سے مطالعہ کیا ہے۔ شاعری

میں میرا خاص مقام ہے اور میری بہت سی نظمیں ملک کے مشہور و معتبر ادبی رسائل میں چھپ چکی ہیں اور آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ میری نظموں کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔

وفیسر: مجھے ادبیات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے آپ اچھے شاعر ہوں گے مگر مجھے شاعر کی ضرورت نہیں ہے۔ شاعرانہ ذہن منطق کی گتھیوں کو سلجھا نہیں سکتا اور نہ فلسفیانہ مسائل پر سنجیدگی سے غور کر سکتا ہے۔

جوان: لیکن پروفیسر آپ اس بات کا تو خیال کیجیے کہ فلسفیانہ مسائل کو جب شاعرانہ رنگینیوں میں رنگا جائے گا تو ان میں کتنی دل کشی اور جاذبیت پیدا ہو جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں میرا شاعرانہ ذوق آپ کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ بھی سنیے کہ میرے متعلق دوستوں کی رائے یہ ہے کہ میں بڑا خوش خلق اور ہنس مکھ شخص ہوں میری طبیعت میں خوش ذوقی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور یقیناً ایک خوش ذوق شخص ہی بہترین سیکرٹری بن سکتا ہے۔

وفیسر: یہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔ میں نہیں۔

جوان: تو میں آپ کو کیوں کر سمجھاؤں؟ کیا آپ کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جس کی طبیعت بشاشت سے محروم اور جس کے ہونٹ مسکراہٹ سے ناآشنا ہوں جو قہقہہ لگانا گناہ سمجھتا ہو۔ میں عرض کرتا ہوں ایسے شخص کے

مقابلے میں میں ہزار درجہ بہتر ہوں۔

پروفیسر: مجھے آپ کی ضرورت نہیں۔

نوجوان: اگر آپ ارشاد فرمائیں تو میں اپنی تازہ نظم سنانے کا شرف حاصل کرلوں

پروفیسر: میں نے کہہ دیا ہے کہ مجھے شعر و نغمہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے میرا مضمون فلسفہ ہے —— اچھا خدا حافظ!

نوجوان: پروفیسر صاحب! عجیب بات ہے۔ آپ مجھے مایوس کرنا چاہتے ہیں اور میں مایوس ہو کر جانا نہیں چاہتا۔

پروفیسر: تو اس کا مطلب یہ ہے تم اپنا اور میرا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہو۔

نوجوان: میں نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا ہے میرے دل و دماغ کے اندھیرے میں امید کی روشنی پھیلتی جاتی ہے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی غیبی آواز میرے کان میں کہہ رہی ہے مایوس نہ ہو تو ضرور کامیاب ہوگا —— تو ایک دن ضرور پروفیسر صاحب کا سیکرٹری بن جائے گا۔ پروفیسر صاحب مجھے اس غیبی آواز پر پورا بھروسہ ہے

پروفیسر: عجب احمق سے سامنا کرنا پڑا ہے آج —— غیبی آواز —— منطق کی دنیا میں غیبی آواز کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تم تو منطق سے بہت دور ہو۔

نوجوان: شکریہ۔ شروع شروع میں میں نے بھی اپنے متعلق یہی رائے قائم کرلی تھی یعنی میں سمجھتا تھا کہ میں احمق ہوں اور اس کی وجہ سے میرے اندر

احساس کمتری پیدا ہو گیا تھا۔

پروفیسر:- احساس کمتری جانتے ہو۔ اس اصطلاح کی فلسفیانہ نوعیت کیا ہے۔

وجوان: جی اپنے آپ کو کسی معاملے میں کمتر سمجھنا۔

روفیسر: یہ بات تو ایک معمولی پڑھا لکھا بھی بتا سکتا ہے۔ جبھی تو میں کہتا ہوں کہ تمہیں فلسفے سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور میں فلسفے پہ جان دیتا ہوں۔ میں زندگی کے ہر معاملے میں منطق چاہتا ہوں۔ شاعری اور منطق دو متضاد چیزیں ہیں۔ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں ۔۔۔ وقت کی پابندی، ہر بات میں فلسفیانہ اصولوں کا احترام، اعلیٰ دماغ میں فلسفیانہ تفکر۔ مجھے ان چیزوں کی ضرورت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ آپ میں نہیں ہیں۔ اور نہ ہی ہو سکتی ہیں۔

جوان: میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں آج ہی کانٹ کا مطالعہ شروع کر دوں گا۔ اور اپنے فرائض ایمانداری سے سرانجام دوں گا۔

وفیسر: فی الحال آپ تشریف لے جائیں۔

جوان: (مایوس ہو کر) اچھا! (جانے لگتا ہے)

وفیسر: دیکھو (فوراً) تم جا رہے ہو۔ مگر میری نصیحت یہ ہے کہ فلسفے کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا، خاص کر کانٹ کا۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ انسانی زندگی کیا ہے۔ اور اس فلسفی نے ہمیں زندگی کے متعلق کیا کچھ بتایا ہے۔ اچھا جاؤ۔

(نوجوان دروازے پہ پہنچ کر رُک جاتا ہے)

جوان: پروفیسر صاحب اس بات کی تو اجازت ہے نا کہ جب کبھی فلسفے کے مطالعے

ہیں وقت پیش آئے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔

پروفیسر: بڑی خوشی سے میں تمہاری ہر دقّت دُور کرنے کی کوشش کروں گا۔

نوجوان: پروفیسر صاحب میں دل و جان سے چاہتا تھا کہ آپ کا سیکرٹری بن کر دُنیا میں نام پیدا کروں۔ مگر، اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

پروفیسر: مجبوری ہے۔ تمہیں بات بات پر شاعری سوجھتی ہے اور یہاں قدم قدم پر منطق کے اصولوں کی پابندی ضروری ہے۔

(گھنٹی بجتی ہے)

نوجوان: میں تین چار دن تک حاضر ہوں گا۔ آج ہی لائبریری میں جا کر کتابیں نکلواتا ہوں

پروفیسر: بہتر۔ خدا حافظ

(نوجوان چلا جاتا ہے نوکر آتا ہے)

نوکر: جی!

پروفیسر: بارہ بجنے میں اڑھائی منٹ باقی ہیں۔ تم کیا کر رہے ہو۔

نوکر: برآمدے میں کھڑا ہوں۔

پروفیسر: برآمدے میں کھڑے ہو مگر تمہارے ہاتھ میں نہ کاغذ ہے نہ پنسل ہے۔ امیدواروں کے نام کیونکر لکھو گے۔

نوکر: آج تو جناب کوئی نہیں آیا۔

پروفیسر: بہت اچھی بات ہے۔ آج جو شخص آئے گا وہ یقیناً وقت کا پابند ہوگا۔

یہی شخص میرا سیکرٹری ہو سکتا ہے۔ کاغذ پنسل اٹھاؤ۔

ہ: ایک عرض ہے۔

فیسر (کلائی کی گھڑی دیکھ کر) ڈیڑھ منٹ باقی رہ گیا ہے۔ وقت نہیں ہے میرے پاس رہ کر تم کچھ بھی نہ سیکھ سکے۔

ہ: اس لیے جانا چاہتا ہوں۔ آج شام چلا جاؤں گا۔

فیسر: بہتر! شام کو تنخواہ لے لینا۔

(ذاکر چلا جاتا ہے۔ کمرے کا کلاک بارہ بجاتا ہے۔ پروفیسر کتاب بند کرکے ایک طرف رکھ دیتا ہے اور دروازے کی طرف دیکھنے لگتا ہے نوکر آتا ہے۔)

: صرف ایک شخص آیا ہے۔ عجیب سا آدمی ہے۔ دیکھ کر ڈر آتا ہے۔

فیسر: لے آؤ!

(نوکر جاتا ہے اور چند لمحوں بعد اس کے ساتھ ایک نوجوان آتا ہے۔ نوجوان کے چہرے پر بشاشت نام کو نہیں۔ غور و فکر کی عادت نے آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے سے پیدا کر دیے ہیں۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں جن پر عینک بہت بدنما معلوم ہوتی ہے —— نوجوان پروفیسر کے پاس آکر رک جاتا ہے۔)

یسر: آئیے تشریف رکھئے (کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) بیٹھ جائیے

(نوکر کے ہاتھ سے کاغذ کا پرزہ لے کر پڑھتے ہوئے) آپ کا اسم شریف عبدالجبّار ہے۔

جبّار: میرا نام جبّار ہے مگر معلوم ہوتا ہے۔ میں یہاں کام کر نہیں سکوں گا۔

پروفیسر: وجہ؟

جبّار: آپ بہت تکلّف سے کام لیتے ہیں۔ اسم شریف کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ منطق کا پہلا اصول یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے صرف اتنا کہا جائے جتنا مناسب ہو۔

پروفیسر: بہت خوب (خوش ہو کر) آج سات روز کے بعد مجھے ایسا شخص ملا ہے جس کی مجھے ضرورت ہے۔ آپ نے کانٹ کا مطالعہ کیا ہے؟

جبّار: کانٹ —— بہت گہری نظر سے۔ اگر اس وقت آپ میرے گھر جائیں۔ یہ ظاہر ہے کہ آپ میرے گھر نہیں جا سکتے۔ کیونکہ میرا گھر میرا گھر ہے۔ اور اس گھر اور اُس گھر کے درمیان فاصلہ ہے۔ مگر آپ فرض کر لیں کہ آپ میرے گھر چلے گئے ہیں۔ وہ دیکھئے میرا بستر ہے۔ تکیے کے اوپر چار پانچ کتابیں پڑی ہیں تکیے کے نیچے بھی کتابیں ہیں۔ یہ میرے محبوب مصنف کانٹ کی ہیں۔

پروفیسر: بس صاحب! مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔ میں مطمئن ہو چکا ہوں۔

جبّار: میں آپ کا سیکرٹری بن گیا ہوں۔

پروفیسر: جی ہاں۔ کل سے آپ میرے سیکرٹری ہیں۔

جبّار: (چہرے پر بدستور سنجیدگی برس رہی ہے۔) فرائض کیا ہیں؟

پروفیسر: صبح نو بجے سے گیارہ بجے تک نوٹ لکھنے اور انہیں صاف کر کے ٹائپ کرنا۔ آپ ٹائپ جانتے ہیں نا؟

جبار: جی ہاں!

پروفیسر: یہ تو خاص طور پر بڑی اچھی بات ہے۔ اچھا گیارہ بجے سے بارہ بجے تک مسودے پر بحث۔ اس کے بعد مجھے کالج میں لیکچر دینا ہوتا ہے۔ اس لیے اس دوران میں آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔

جبار: جو چاہوں کر سکتا ہوں؟

وفیسر: جی ہاں۔ میری لائبریری میں جا کر مطالعہ کیجیے یا آرام کیجیے۔ پھر دو بجے سے چار بجے تک نوٹ لکھنے اور انہیں صاف کرنا۔ چار سے پانچ بجے تک مسودے پر بحث کرنا۔

بار: پروفیسر صاحب ایک بات سن لیجیے۔ ایک مرتبہ جو پروگرام بن جاتا ہے۔ میں اس پر سختی سے عمل کرتا ہوں

وفیسر: یہی تو خوبی میرے سیکرٹری میں ہونا چاہیے۔ اب رہ گئی تنخواہ تو۔ ۔ ۔

بار: (بات کاٹ کر) معاف کیجیے۔ تنخواہ اشتہار میں درج ہے۔

وفیسر: ویسے بتا دینا چاہتا تھا۔

بار: ایک بات کو بغیر کسی وجہ کے دوبارہ کہنا منطقیانہ اصول کے خلاف ہے

وفیسر: (خوش ہو کر) بالکل درست فرمایا آپ نے۔ کل نو بجے آپ کا انتظار

کروں گا۔

جبار: پروفیسر صاحب! جب پروگرام مرتب ہو چکا ہے تو یقیناً مجھے ۹ بجے ہی آنا چاہیے۔ آپ انتظار کریں یا نہ کریں۔

پروفیسر: (ذرا شرمندہ ہو کر) معاف کیجیے۔ ایک بات کو بار بار اس لیے کہتا ہوں کہ آج تک کوئی منطقی ذہن کا سیکرٹری نہیں مل سکا تھا۔ عام لوگوں سے باتیں کرتے وقت منطق کو نظر انداز کرنا ہی پڑتا ہے۔

جبار: منطق کو چھوڑ دیں تو باقی زندگی میں رہ ہی کیا جاتا ہے؟

پروفیسر: یہ آپ جانتے ہیں یا میں جانتا ہوں۔ دوسرے لوگ نہیں جان سکتے۔

جبار: ہمیں ایسے لوگوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ ہاں آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں؟

پروفیسر: کانٹ کے متعلق ایک ضخیم کتاب۔

جبار: اچھی بات ہے۔ کانٹ کے متعلق مجھے بے حد دلچسپی ہے۔

پروفیسر: کل نو بجے آپ . . . . . .

جبار: (الفاظ کاٹ کر) آداب عرض۔

(جبار چلا جاتا ہے۔ پروفیسر اپنی کتاب اٹھا کر الماری میں رکھ دیتا ہے۔) X

دوسرا منظر

منظر: (وہی کمرہ۔ پروفیسر پلنگ پر نیم دراز ہے۔ رضیہ آتی ہے)

رضیہ: ابا جان اب طبیعت کیسی ہے؟

پروفیسر: سینے میں درد ہے۔

رضیہ: تو اب ڈاکٹر کو بلایا جائے۔

پروفیسر: نہیں۔ وہ دیکھو الماری کے سب سے اوپر کے خانے میں لال جلد والی کتاب پڑی ہے۔ وہ ذرا دینا۔

رضیہ: ہائے اللہ تکلیف کی حالت میں بھی آرام نہیں کرتے۔ میں تو کتاب وتاب نہیں دوں گی۔

پروفیسر: معمولی تکلیف ہے۔

رضیہ: معمولی تکلیف ہی بڑھ کر خطرناک ہو سکتی ہے۔ علاج معالجے کی طرف تو آپ توجہ کرتے ہی نہیں۔ رات سے درد ہو رہا ہے۔ بار بار کہتی ہوں کہ ڈاکٹر کو بلا لیا جائے۔ مگر آپ پروا ہی نہیں کرتے۔

پروفیسر: معمولی درد ہے۔

رضیہ: ساری رات رہا ہے اور اب بھی ہے۔ یہ بھلا معمولی درد کیونکر ہو سکتا ہے؟ سانس لیتے وقت تکلیف تو نہیں ہوتی؟

وفیسر: کچھ ہوتی ہے۔ خیر کالج سے لڑکے آنے والے ہیں۔ میں یہیں لیکچر دوں گا۔

ضیہ: لڑکے آئے تھے۔

وفیسر: تو کہاں ہیں؟

ضیہ: میں نے انہیں واپس بھیج دیا ہے۔ جان ہے تو جہان ہے۔ صحت قائم رہی تو لیکچر بھی ہو جائے گا۔

وفیسر: آج انیس سال کی مدت میں پہلا دن ہے کہ میں لیکچر نہ دے سکا۔ میں اپنا فرض نہیں ادا کر سکا۔ لڑکوں کو یہیں بلایا تھا۔ مگر تم نے انہیں مایوس کر کے بھیج دیا۔

ضیہ: اگر میں رات کو اتفاق سے نہ آ جاتی۔ تو آپ کالج جا کر ضرور اپنے ساتھ دشمنی کرتے۔

پ وفیسر: کاہل تو نہ ہونا چاہیئے مجھے۔ (اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر درد کی شدت سے دوبارہ لیٹ جاتا ہے)

رضیہ: ابا جان! خدا کے لیے اپنے ساتھ دشمنی نہ کیجیے۔ مہربانی کر کے لیٹے رہیئے۔

پروفیسر: آج سارا پروگرام تہس نہس ہو گیا۔

رضیہ: تو پھر کیا ہوا! انسان آخر انسان ہے۔ مشین تو نہیں ہے —— اور ابا جان! وہ چقندر کا بنا ہوا آدمی ہمارے گھر میں کہاں سے آ گیا ہے؟

پروفیسر: کون؟

رضیہ: وہ جو لائبریری میں بیٹھا ہے۔ تو بڑا عجیب قسم کا آدمی ہے۔ صبح تھا اُس کے

پاس چلا گیا۔ اور دیر تک اس کے پاس کھڑا رہا۔ مجھے پیار کرتا رہا۔ ایک طرف اس شخص نے آنکھ اُٹھا کر بھی بچے کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا۔ بیٹھا چپ چاپ ٹپ ٹپ کرتا رہا

وفیسر: وہ میرا سیکرٹری ہے۔

ضیہ: آپ کا سیکرٹری تو آپ سے بھی دس قدم آگے ہے۔ یہ گھر کیا ہے۔ اچھا
کا کوئی غار ہے۔ جہاں انسانوں کی بجائے پتھر کے مجسمے پڑے ہیں۔

وفیسر: ایسا اچھا سیکرٹری تو تمام دُنیا میں بھی نہیں مل سکتا تھا۔ بڑا فرض شناس اور
اصول کا پابند ہے۔

رضیہ: تو یہ دُنیا میں کیسے کیسے لوگ آباد ہیں۔

(پروفیسر درد سے بے قرار ہو کر چھاتی پہ ہاتھ رکھ لیتا ہے)

ضیہ: کیوں ابّا جان درد بڑھ گیا ہے؟

پروفیسر: ہاں۔

(کلاک دو بجاتا ہے۔ دروازے کے باہر سے سیکرٹری کی آواز آتی ہے۔
"پروفیسر صاحب" اور دوسرے لمحے میں سیکرٹری ہاتھ میں مسودہ ——
نوٹ بک اور پنسل لیے ہوئے کمرے کے اندر آتا ہے اور پلنگ
کے پاس کُرسی میں بیٹھ جاتا ہے)

رضیہ: لیجئے آپ کے سیکرٹری صاحب آ گئے۔

پروفیسر: آؤ سیکرٹری۔

سیکرٹری: (بغیر کسی رسمی گفتگو کے مسودے پر نگاہیں جماتے ہوئے) پروفیسر صاحب! یہاں آپ نے کانٹ اور جرمن کے عنوان سے ایک باب لکھا ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے (پڑھتا ہے۔ رضیہ دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔) "کانٹ کے نقطۂ نظر سے انسانی اعمال کا نتیجہ ان کے نتائج کے لحاظ سے لگانا درست نہیں ہے۔ وہ سب سے زیادہ زور اس بات پر دیتا ہے کہ انسان کے ہر عمل کا سرچشمہ صرف احساسِ فرض ہونا چاہیے۔ ہمیں ہر حال میں لذت و الم کے ہر احساس سے بے نیاز ہو کر اپنا فرض ادا کرنا چاہیے زندگی کے اس سب سے بڑے اصول کے معاملے میں استثنا کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو وقت جس کام کے لیے متعین کر دیا گیا ہے۔ وہ وقت صرف اسی فرض کے لیے مخصوص ہو جانا چاہیے۔ یہی ذریعہ ہے کاملیت کے حصول کا۔ اور یہی وہ طریقہ ہے۔ جو ہمارے اندر اپنے فرض پر کاربند رہنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے ——"

پروفیسر: (درد سے بے قرار ہو کر) ذرا ٹھہرو۔

سیکرٹری: (نوٹ لکھنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے) لکھائیے۔

پروفیسر: سینے میں درد ہے ——

سیکرٹری: (لکھنے لگتا ہے) سینے میں درد —— مگر پروفیسر صاحب اس فقرے کا کانٹ کی شائیت سے کیا تعلق تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔

پروفیسر: نہیں! ابھی میرے سینے میں درد ہے۔

سیکرٹری: (بے نیازی سے) اچھا! — بیٹھ کر لکھائیے۔ یہ باب مکمل نہیں ہے۔ چند روز ہوئے پروفیسر ہیرش مان نے کانٹ کے متعلق ایک نئی کتاب شائع کی ہے۔ جس کا نام "کانٹ اور اخلاقیات" ہے۔ میں نے دوکاندار کو آرڈر دے دیا ہے شام تک آجائے گی۔

پروفیسر: اس وقت مسودہ رکھ دو۔ پھر غور کر لیں گے۔

سیکرٹری: پروفیسر صاحب! یہ وقت تو نوٹ لکھنے کے لیے وقف ہے۔ کل صبح اس باب کو ٹائپ کرنا ہے۔ آج مکمل ہو جانا چاہیئے اسے۔ "کانٹ کی مثالی اخلاقیت" کا باب ابھی نامکمل ہے۔

پروفیسر: ہوگا۔

سیکرٹری: ابھی ابھی میں ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔ اس میں لکھا ہے۔ کہ کانٹ جس عورت سے شادی کرنی چاہتا تھا۔ اس سے شادی نہ کر سکا۔ اس لیے ساری عمر کنوارا رہا۔ پروفیسر صاحب! یہ غلط بات ہے۔ آپ اپنی کتاب میں کانٹ کی سوانح عمری بھی لکھیں۔ کانٹ شادی کو اپنے علمی مشاغل میں رکاوٹ سمجھتا تھا اس لیے.....

پروفیسر: ہائے درد تو. .

(رضیہ آتی ہے)

سیکرٹری: بیٹھ جائیے پروفیسر صاحب اپانی پی لیجئے ۔۔۔ اوہ تین منٹ ضائع ہو گئے ۔ اور ابھی تک نوٹ نہیں لکھا۔

(رضیہ قریب آتی ہے)

رضیہ: سیکرٹری صاحب۔ ابا جان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ انہیں پریشان نہ کریں۔

سیکرٹری: مگر یہ وقت تو نوٹ لکھنے کا ہے ۔۔۔ کہیئے پروفیسر صاحب صبح آپ نے یہ نوٹ لکھوایا تھا (پڑھتا ہے) "کانٹ اپنے عہد کے تمام فلسفیوں سے الگ نظر آتا ہے۔ وہ انسانی جبلت کے بارے میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رضیہ: (بات کاٹ کر) میں کہتی ہوں پروفیسر صاحب علیل ہیں۔ رات سے ان کے سینے میں درد ہے۔

سیکرٹری: یہ باب تو شام تک مکمل ہو جانا چاہیئے۔ کل ٹائپ کرنا ہے۔

پروفیسر: اُف (کمزور آواز میں) سیکرٹری۔

سیکرٹری: جی فرمایئے۔

پروفیسر: ڈاکٹر

سیکرٹری: (لکھتے ہوئے) ڈاکٹر

پروفیسر: (پہلے سے زیادہ کمزور آواز میں) ڈاکٹر۔

یکرٹری: جی لکھ لیا ہے۔ ڈاکٹر۔ آپ کی مراد کانٹ کے نقاد ڈاکٹر ہندریتاکش سے ہے۔

وفیسر: لاؤ۔

یکرٹری: ڈاکٹر لاؤ۔ یہ کہاں کا ڈاکٹر ہے پروفیسر صاحب: "ڈاکٹر لاؤ" پورا نام کیا ہے۔

پروفیسر: نہیں ڈاکٹر کو لاؤ۔

یکرٹری: اچھا پورا نام "ڈاکٹر کو لاؤ" ہے (لکھتے ہوئے) "ڈاکٹر کو لاؤ" آگے لکھائیے۔

رضیہ: (برافروختہ ہوکر) سیکرٹری صاحب آپ کی سمجھ پر پتھر پڑ چکے ہیں۔ ابا جان درد سے مرے جا رہے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔ اور آپ "ڈاکٹر لاؤ" "ڈاکٹر کو لاؤ" نہ جانے کیا انٹ شنٹ لکھ رہے ہیں۔

سیکرٹری: کتنی غیر منطقیانہ بات ہے۔ یہ وقت نوٹ لکھنے کا ہے۔

(رضیہ آگے آکر باپ کے چہرے پر جھکتی ہے)

رضیہ: (گھبرا کر) ابا جان! ——— ابا جان!!

پروفیسر: ہوں (آنکھیں کھول کر) ڈاکٹر۔

رضیہ (سیکرٹری سے) جلدی کیجئے۔ ڈاکٹر کو بلا لائیے۔

سیکرٹری: مگر نوٹ؟ یہ وقت تو نوٹ لکھنے کا ہے۔

رضیہ: لعنت ہو تمہارے نوٹ پر۔ ابا جان درد سے مرے جا رہے ہیں۔ اور انہیں نوٹ کی پڑی ہوئی ہے۔ خدا کے لیے بھاگ کر جائیے اور ڈاکٹر کو بلا لائیے۔ دیکھتے نہیں ان کے چہرے کا رنگ کتنا زرد پڑ گیا ہے۔

سیکرٹری: کاش آپ نے کانٹ کا مطالعہ کیا ہوتا۔ یہ کتاب چھپ جائے۔ تو سب سے پہلے آپ اسے پڑھیے۔ کانٹ کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ جو وقت جس کام کے لیے وقف ہو وہ اسی کام میں صرف ہونا چاہیے۔

رضیہ: ابا جان یہ پتھر کا بت نہیں جائے گا۔ میں خود جاتی ہوں۔

سیکرٹری: تو میں لائبریری میں جا کر انتظار کرتا ہوں — یہ باب تو آج ہی مکمل ہو جانا چاہیے۔

(سیکرٹری کمرے سے نکل جاتا ہے)

تیسرا منظر

(پروفیسر پلنگ پر تکیے کا سہارا لیے بیٹھے ہیں۔ سینے پر پٹی بندھی ہے۔

رضیہ ہاتھ میں پیالی لے کر آتی ہے۔)

یہ: لیجئے آبا جان دوا ——— نو بجنے ہی والے ہیں۔

وفیسر: کیا ہے ؟

ضیہ: آبا جان خدا کے لیے اس وقت تو فلسفے کا خیال چھوڑ دیجئے۔

وفیسر: فلسفے کا خیال نہیں ہے۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ تم اتفاقاً نہ آجاتیں
تو یہ سیکرٹری تو آخری سانس تک ٹس سے مس نہ ہوتا۔

ضیہ: یہ انسان کا ہے کو ہے۔ لوہے پتھر کا بت ہے۔ توبہ دن بس کرتا ڈکٹر
کرلاؤ۔

وفیسر: ہوں، وقت تو کافی کم ہو گیا ہے۔

ضیہ: آبا جان! اب تو آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ انسان ——— انسان پہلے
ہے اور بعد میں منطقی، فلسفی اور خدا جانے کیا کیا کچھ۔

(کلاک نو بجاتا ہے۔ دروازے کے باہر سے آواز آتی ہے: ”پروفیسر صاحب“
اور دوسرے لمحہ میں سیکرٹری نوٹ بک اور پنسل لے کر آتا ہے اس
کے دوسرے ہاتھ میں مسودہ ہے اور مسودے کے ساتھ کتاب بھی)

یکرٹری: پروفیسر صاحب! یہ ہے پروفیسر ہیرش مان کی کتاب ”کانٹ اور
اخلاقیات“ میں نے پڑھ لی ہے۔ اور وہ باب بھی مکمل کر لیا ہے۔ سناتا
ہوں۔

پروفیسر: سیکرٹری صاحب! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ جیسے منطقی سیکرٹری کے قابل نہیں ہوں۔

سیکرٹری: آپ میرے قابل نہیں ہیں، منطق کے نقطۂ نظر سے آپ کی بات قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ آپ نے میرے ذمے چند فرائض کیے تھے۔ اور میں انہی فرائض کے لیے سیکرٹری مقرر ہوا تھا۔ جب میں مقررہ فرائض ادا کر رہا ہوں تو۔ ۔ ۔

پروفیسر: اب میری رائے تبدیل ہو چکی ہے۔

سیکرٹری: آپ کی رائے تبدیل ہو چکی ہے۔

پروفیسر: اب صرف آپ اس شرط پہ یہاں رہ سکتے ہیں۔ کہ منطق کو دماغ سے نکال دیں۔

سیکرٹری: میں منطق کو دماغ سے نکال دوں تو باقی کیا رہ جائے گا؟

پروفیسر: انسانیت۔

سیکرٹری: پروفیسر صاحب! میں منطق کو اپنے دماغ سے نہیں نکال سکتا۔

پروفیسر: تو مجھے افسوس ہے میں آپ کو یہاں سے نکالنے پر مجبور ہوں۔

—— خدا حافظ! (سیکرٹری چلا جاتا ہے)

رضیہ: (ہنس کر) خدا کی پناہ! کتنا عجیب و غریب انسان ہے۔

پروفیسر: یہ دنیا عجیب و غریب انسانوں سے بھری پڑی ہے بیٹی!

(باہر سے آواز آتی ہے پروفیسر صاحب)

رضیہ: پھر گیا۔

پروفیسر: نہیں، یہ تو کوئی اور ہے (آواز دے کر) آئیے! کون صاحب ہیں؟

(محمود نیازی آتا ہے۔ بازوؤں پہ دس بارہ موٹی موٹی کتابیں اٹھائے ہوئے ہے)

محمود نیازی: آداب عرض پروفیسر صاحب!

(تعظیم کتابیں ایک طرف رکھ دیتا ہے اور ہانپتے ہوئے پروفیسر کے قریب مؤدبانہ
کھڑا ہو جاتا ہے)

پروفیسر: فرمائیے!

محمود نیازی: جی آپ نے فرمایا تھا کہ مجھے منطقی سیکرٹری کی ضرورت ہے ——
جناب! —— تو۔

پروفیسر: آپ ہانپ کیوں رہے ہیں؟

محمود نیازی: اتنی کتابیں اٹھا کر لایا —— ہوں۔

پروفیسر: کیوں؟

محمود: آپ نے فرمایا تھا —— نا کہ مجھے —— منطقی سیکرٹری کی ضرورت ہے ——
میں نے پروفیسر صاحب! منطق کی سب —— تقریباً سب کی سب ——
کتابیں پڑھ ڈالی ہیں —— یہ نئی کتابیں —— آج خریدی ہیں۔ آپ اندازہ کر
سکتے ہیں۔ میں اپنے فرائض کتنی خوش اسلوبی سے انجام دوں گا!

پروفیسر: تو آپ منطقی ہو چکے ہیں۔

محمود نیازی: جی جناب!

پروفیسر: تو فی الحال میں آپ سے یہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ منطق کے بوجھ کو اٹھا کر یہاں سے تشریف لے جائیں۔

محمود نیازی: مگر — پروفیسر صاحب! میں نے کانٹ کا مطالعہ کر لیا ہے — میں نے — میں نے کانٹ —

پروفیسر: مجھے منطقی سیکرٹری کی ضرورت نہیں ہے۔

محمود نیازی: تو آپ کو کیسے سیکرٹری کی ضرورت ہے؟

پروفیسر: ایک عام انسان کی — جو دل لگا کر سیکرٹری کے عام فرائض ادا کر سکے۔

محمود نیازی: تو منطقی ہونا اس کے لیے بالکل ضروری نہیں ہے؟

پروفیسر: نہیں۔

محمود نیازی: تو پروفیسر صاحب! میں بڑی خوشی سے اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔ کئی دن تک فلسفے میں سر کھپاتا رہا۔ مگر منطقی نہیں بن سکا۔

پروفیسر: اور یہ ضخیم کتابیں۔

محمود: یہ تو مانگ کر لایا ہوں — یہ تو ہی ہی ہی ہی — (ہنستے ہنستے سر جھکا لیتا ہے)

(پردہ)

اور یوں بھی ہوتا ہے

پہلا منظر

(ایک کمرہ۔ کمرے میں ایک صاحب جن کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی، اپنے دونوں ہاتھ پشت پر رکھے ٹہل رہے ہیں ——— یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی اہم مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔ چہرے سے ایسے آثار نمایاں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ محنت شاقہ کے عادی ہیں۔ سر گنجا ہے ——— ادھر سے تنویر آتا ہے۔ تنویر اس وقت بادامی رنگ کے سوٹ میں ملبوس ہے۔ وہ صاحب مڑ کر تنویر کو دیکھتے ہیں۔)

وہ صاحب: کون ——— اوہ سمجھا۔ تشریف لائیے ——— آئیے نا!

تنویر: السلام علیکم قبلہ!

وہ صاحب: وعلیکم السلام۔ طبیعت ٹھیک ہے برخوردار؟

تنویر: جی قبلہ!

وہ صاحب: تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا۔ تم آؤ گے۔ اور اسی وقت آؤ گے۔

تنویر: قبلہ! معاف کیجئے۔ ذرا دیر سے پہنچا۔

وہ صاحب: ہاں۔ تم کسی قدر لیٹ ہو۔

تنویر: معاملہ یہ ہوا قبلہ! کہ راستے میں ایک حادثہ پیش آ گیا۔

وہ صاحب: حادثہ —— "حادثے ثا" —— یعنی ایک "حادثے ثا" پیش آگیا۔

تنویر: جی ——

وہ صاحب: تو تمہیں ایک "حادثے ثا" پیش آگیا۔

تنویر: (گھبرا کر) معاملہ یہ تھا کہ راہ میں بیمہ کمپنی کا ایک ایجنٹ مل گیا۔ کئی منٹ ضائع کر دیئے اس نے۔ بڑی مشکل سے ٹالا اور یہ کہہ کر ٹالا کہ دو بجے کے بعد گھر آنا۔ ظاہر ہے بیمہ کمپنی کے ایک ایجنٹ سے ملاقات (ہنس کر) ایک حادثہ ہی ثابت ہوا کرتی ہے۔

وہ صاحب (فلسفیانہ انداز میں) ہاں اسے حادثہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور نہیں بھی کہہ سکتے۔ تم حادثہ ثابت کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ ہر انسان اپنے اعمال میں آزاد ہے۔

تنویر: آپ نے درست فرمایا قبلہ!

وہ صاحب: درست! تو تم اسے درست سمجھتے ہو؟

تنویر: جی جی!

وہ صاحب: برخوردار میں نے آج تک کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جو خلاف واقعہ ہو۔ یا جسے سن کر کوئی شخص راہِ راست سے بھٹک جائے میری زندگی کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ جو کچھ کہو حقیقت کے عین مطابق کہو

سُنا برخوردار! ارے تم بیٹھ کیوں نہیں جاتے —— اِس قسم کا تکلف مجھے پسند نہیں۔ مجھے کیا کسی کو بھی پسند نہ ہوگا۔ تم نے وہ شعر سُنا ہے —

تنویر: وہ اُستاد ذوق کا شعر؟

وہ صاحب: کیا۔

تنویر: وہ —— جی —— اے ذوق! —— ہاں یاد آگیا۔

اے ذوق! تکلف میں ہے تکلیف سراسر
اچھے ہیں وہی جو کہ تکلف نہیں کرتے

وہ صاحب: یہ شعر اچھا ہے۔ مگر وہ شعر تو بہت خوب ہے۔

تکلف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

تنویر: (سراسیمہ ہو کر) جی!

وہ صاحب: ارے تم گھبرا کیوں گئے ہو؟ ——

تنویر: جی نہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ آپ بذلہ سنج اور خوش مذاق ہیں ——

وہ صاحب: میرے بارے میں یہ قیمتی معلومات کس نے بتائی ہیں؟

تنویر: —— کسی نے بھی نہیں۔

وہ صاحب: کسی نے نہیں بتائیں؟

تنویر: قبلہ! آپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کافی بذلہ سنج ہیں (ہنس کر) آپ بہت خوش مذاق ہیں۔

اور یوں گویا ہوتا ہے۔

وہ صاحب: بہت بہت شکریہ، برخوردار، یہ میرا حوصلہ ہے کہ اس قسم کے ماحول میں اپنی خوش مذاقی کو سلامت رکھا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو اب تک ڈاکٹر کی بجائے انہی لوگوں میں شامل ہو چکا ہوتا

تنویر: کن لوگوں میں جناب؟

وہ صاحب: پاگلوں میں۔

تنویر (ہنستا ہے): اچھا۔

وہ صاحب: (سنجیدگی سے) برخوردار بزرگوں کے سامنے ہنسا نہیں کرتے۔

تنویر: جی —— یہ ہنسی تو ——۔

وہ صاحب: کہاں تک تعلیم ہے تمہاری؟

تنویر: ایم۔ اے کا طالب علم ہوں، انگریزی ادبیات میرا مضمون ہے۔

وہ صاحب: انگریزی ادبیات —— بہت خوب —— ارے بھئی ابھی تک بیٹھے کیوں نہیں۔ بیٹھ جاؤ نا بھئی۔

(تنویر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

تو تم انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کر رہے ہو —— ذاتی طور پر میں ادب کو بہت پسند کرتا ہوں اور ——

تنویر: آپ نے بھی —— انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کیا ہے؟

وہ صاحب: مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تم میں وہ چیز نہیں جسے صبر و تحمل کہتے ہیں

خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ تم اپنے برخوردار ہو۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان جو کچھ کہے صبر و تحمل سے کہے۔ ورنہ ایک عقلمند آدمی اور ایک پاگل میں کیا فرق باقی رہ جائے گا؟ عقلمند آدمی سنجیدگی کے ساتھ بات کرتا ہے۔ جو کچھ اُسے کہنا ہوتا ہے، سوچ سمجھ کر کہتا ہے مگر اس کے مقابلے میں ایک پاگل آدمی بے کار شور مچانا شروع کر دیتا ہے۔ تم میرے پاس آئے ہو، تو میرا فرض ہے کہ اپنی زندگی کا اثاثہ تمہارے حوالے کرنے سے پہلے تمہیں کچھ نصیحتیں کر دوں یہ نصیحتیں تمہاری زندگی میں بہت کام آئیں گی۔ سُن رہے ہو برخوردار؟

تنویر: بڑے غور سے سُن رہا ہوں۔

وہ صاحب: یہ کہو بڑے صبر و تحمل سے سُن رہا ہوں۔ لفظوں کا غلط استعمال بعض اوقات آدمی کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ میں تمہیں اپنے صبر و تحمل کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ آج سے کئی سال پہلے جب میں تمہاری طرح طالب علم تھا۔ تو بڑے صبر و تحمل سے بزرگوں کی باتیں سُنا کرتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں اپنے ایک پروفیسر کے گھر گیا۔ وہ کسی تجربے میں منہمک تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے فرمایا۔ برخوردار صبر و تحمل سے کام لو۔ اور وہ اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ تو جناب میں پورے تین گھنٹے سینتالیس منٹ اور بتیس سیکنڈ دروازے پر کھڑا رہا۔

نویر : (ہنس کر) قبلہ! آپ کا حافظہ بہت تیز ہے۔ سیکنڈ بھی یاد رکھے!

ده صاحب : تم پھر ہنسے؟

تنویر : یہ ہنسی تو قبلہ حیرت کے اظہار کے لیے تھی۔

ده صاحب : حیرت کے اظہار کے لیے تھی (بلند قہقہہ لگا کر) ایک نیا تجربہ — ایک بالکل نیا تجربہ — مگر تم گھبرا کیوں گئے برخوردار! میری ساری کی ساری زندگی نئے نئے تجربات میں گذری ہے۔ نیا تجربہ وہی شخص کر سکتا ہے جس میں جرأت، بہادری اور ارادے کی بلندی ہو۔ ہر شخص نئے تجربات نہیں کر سکتا۔ پاگل آدمی کو لوگ قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔ اس کی حرکت پر ہنستے ہیں اس کی باتوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں پاگل پن میں زندگی کا ایک بالکل نیا تجربہ ہے۔ عقل اور روایت کی پٹی پٹائی راہ سے ہٹ کر زندگی کے بارے میں ایک نیا تجربہ کرنا — ایک نیا نظریہ قائم کرنا — کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہرگز معمولی نہیں — میں تمہیں ایک شعر سناتا ہوں۔ بڑا لطیف شعر ہے۔ سنو برخوردار! ایک شاعر نے کہا ہے۔

اُف وادیِ جنوں کے وہ پُر پیچ راستے
دیوانگی کو بھی کوئی فرزانہ چاہیے

تمہیں تو اس قسم کا تجربہ نہیں ہوا ہوگا — ممکن ہے تمہارے خاندان میں کسی شخص نے ہمت کی ہو۔

تنویر: آپ تو بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔

وہ صاحب: میں بڑا دلچسپ آدمی ہوں ــــ یقیناً، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے فرسودہ نظریات کا دامن چاک کر دیا ہے۔ جس زمانے میں ہمارے طالب علم کھیل کود میں مشغول رہتے ہیں یا ہوٹلوں میں بیٹھ کر گپیں ہانکا کرتے ہیں، میں اس وقت زندگی کے نئے نئے حقائق کی جستجو میں سرگرداں تھا۔ سڑک کی اس طرف ایک درخت ہے۔ کالج سے واپس آکر اس درخت کے اوپر چڑھ جاتا۔ اور کائنات کی حقیقتوں پر غور کرتا تھا۔

تنویر: (ہنس کر) درخت کے اوپر چڑھ کر۔ اگر کسی روز گر پڑتے تو ــــ

وہ صاحب: بے وقوف ــــ تم بالکل بے وقوف ہو ــــ اتنا نہیں سوچتے کہ میں اونچے درخت پر اس لیے چڑھ جاتا تھا کہ ارد گرد اچھی طرح نظر ڈال سکوں بلندی تک پہنچنا بھی ایک بڑا دلچسپ تجربہ ہے برخوردار ــــ ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں۔

تنویر: تو قبلہ! ــــ کیا اب مجھے جانے کی اجازت ہے؟

وہ صاحب: قبلہ، قبلہ! یہ کیا بدتمیزی ہے ــ مجھے ڈاکٹر کہہ کر پکارو۔

تنویر: تو ڈاکٹر صاحب! مجھے جانے کی اجازت دیجئے ــــ آپ سے ملاقات کر کے بڑی خوشی ہے ــــ واقعی آپ دوسروں سے بالکل مختلف طریقے پر سوچتے ہیں! اور باتیں کرتے ہیں!

صاحب: جس مقصد کے لیے برخوردار! تم آئے ہو اس کے متعلق تو ابھی ایک بات بھی نہیں ہوئی۔ گھر جانے کی اتنی جلدی کیوں ہے تمہیں؟

یر: ایک دو ضروری کام ہیں۔

صاحب: کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں اور ہوتے ہی رہیں گے۔ ذرا میرے قریب آؤ۔ گھبراؤ نہیں، بالکل گھبراؤ نہیں، آخر اس میں گھبرانے کی بات کیا ہے، میں ذرا تمہارے چہرے کو غور سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ میرا اصول ہے کہ سب سے پہلے اپنے عزیز شاگرد کے چہرے پر غور کیا کرتا ہوں۔

—— اچھا، بیٹھے رہو، میں خود آجاتا ہوں (وہ صاحب تنویر کے پاس جاتے ہیں)

تمہاری پیشانی فراخ ہے، آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہے، تم محنتی ہو۔

—— میں تم سے بالکل مطمئن ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں، میں نے تمہیں پسند کر لیا ہے۔ اب سنو، میں دو تین سوال پوچھتا ہوں۔ ان کے جواب دو، پہلا سوال یہ ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ انسان پاگل کیوں ہو جاتا ہے؟ ——

یر: قبلہ! میں یہ پوچھنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس سوال کا میری ذات سے کیا تعلق ہے؟ —— یا اس مقصد سے کیا تعلق جس کی خاطر میں حاضرِ خدمت ہوا ہوں؟

صاحب: دیکھا نا —— میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا۔ کہ تم میں صبر و تحمل کی

گئی ہے۔ شکر کرو میں ڈاکٹر ہوں۔ اگر ماسٹر ہوتا تو معلوم ہے ایسی لغو ــــ بات کہنے پر تمہیں کیا کہتا ــــ کیا کہتا بتاؤ تو؟

تنویر: معلوم نہیں۔

وہ صاحب: (قہقہہ لگا کر) میں کہتا Stand up on the Bench ــ شکر کرو اس وقت تمہارے سامنے ڈاکٹر ہے۔ ماسٹر نہیں ہے۔ ہاں تو میرا پہلا سوال یہ ہے کہ انسان پاگل کیوں ہو جاتا ہے؟ ــــ یعنی ایک آدمی عجیب عجیب حرکتیں کیوں کرنے لگتا ہے؟ ــ (سنجیدگی سے) برخوردار! تمہیں اپنی زندگی میں سنجیدگی پیدا کرنا ہوگی ــــ سنجیدگی سے اس کا جواب دو۔

تنویر: مگر جناب میں نے کبھی ایسی باتوں پر غور نہیں کیا۔

وہ صاحب: کیوں نہیں کیا ــــ جب تک غور نہیں کرو گے۔ زندگی کی حقیقتوں کو کس طرح سمجھ سکو گے؟ اس نیلے آسمان کے نیچے اور اس ہر طرف پھیلی ہوئی زمین کے اوپر بے شمار ایسی چیزیں ہیں جنہیں انسان ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔ ان چیزوں کے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ کام اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم لوگ اپنے اندر غور کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیں۔ تم ابھی اس قابل نہیں ہوئے کہ حقیقتوں کا جائزہ لے سکو! خیر یہ فرض مجھ پر عائد ہوتا ہے کہ تمہیں پاگل پن کا فلسفہ سمجھاؤں ــــ مجھ میں اور تم

یہی سب سے بڑا اہم فرق ہے کہ میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ اور تم سمجھتے ہو۔

یہ، پاگل پن کا فلسفہ —— ؟ قبلہ! معاف کیجئے۔ جس مقصد کے لیے میں آیا ہوں
اُس کا پاگل پن کے فلسفے سے کیا تعلق ہے؟

صاحب: بہت گہرا تعلق ہے ورنہ تمہیں کیونکر اپنا عزیز شاگرد بنا سکتا
ہوں۔

ذیر: —— مگر میں آپ کا عزیز شاگرد بننے کے لیے تو نہیں آیا۔ خالہ جان نے
کہا تھا، آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں —— یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ
آپ اس قسم کے سوالات کریں گے؟

صاحب: اوہو، برخوردار! کتنے افسوس کی بات ہے۔ تم نے ابتدا
ہی میں صبر و تحمل کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔ کتنے بے صبر
ہوتے ہیں آج کے نوجوان، بہرحال مجھے اصلاح کرنا ہوگی۔ اور میرے سوا
کون اصلاح کر سکتا ہے۔ سمجھتے ہو۔ میں تمہیں اپنی زندگی کا اثاثہ دے رہا ہوں
—— میں تمہیں دنیا کا عقلمند ترین انسان بنانا چاہتا ہوں۔ کیا سمجھتے ہو تم!
—— اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ انسان پاگل کیوں ہو جاتا ہے ——
میں نے اس فلسفے پر بڑا کام کیا ہے —— بڑی ریسرچ کی ہے۔ جب
کہیں جا کر کامیاب ہوا ہوں۔ پہلے تمہیں یہ بتا دوں کہ ریسرچ کا شوق
مجھے کیونکر ہوا۔ پاگل خانے میں ایک پاگل تھا، وہ اپنے آپ کو اسداللہ

خاں غالب کہتا تھا (قہقہہ لگا کر) نقلی اسد اللہ خاں غالب۔ وہ لہک لہک کر شعر پڑھا کرتا تھا ۔۔۔ تمہیں غالب کے شعر یاد ہوں گے ۔۔۔ ہاں ضرور ہوں گے ۔۔۔ تو وہ غالب کے شعر پڑھتا رہتا تھا۔ اس کے پڑھنے کا انداز بھی بانکا تھا ۔۔۔ ایک دو شعر سناؤں (بھونڈے انداز سے گا کر)

دلِ ناداں! تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

تنویر: (ہنسی روک کر) خوب!

وہ صاحب: اس نقلی اسد اللہ خاں غالب کو دیکھ کر میرے دل میں خیال پیدا ہوا۔ کہ میں پاگل پن کی تہ تک پہنچوں۔ اور مسلسل کوشش کے بعد میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ عام ڈاکٹر پاگلوں کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں۔ اور جس طریقے سے اُن کا علاج کرتے ہیں۔ وہ بالکل دقیانوسی ہے

اور یوں بھی ہوتا ہے۔

اب تم میرے عزیز بن چکے ہو۔ میں تمہیں چند راز بتاتا ہوں —— جب یہ راز تمہیں معلوم ہو جائیں گے تو تمہاری عقل پہلے سے ہزار گنا تیز ہو کر تابناک ہو جائے گی۔ تم زندگی کو ایک نئے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگو گے۔ اور تم اپنے آپ کو دوسروں سے بالکل مختلف پاؤ گے۔ میں تمہیں جو کچھ بتانے والا ہوں۔ وہ میرے پندرہ سالہ تجربات کا نچوڑ ہے —— برخوردار! پندرہ سال تک میں نے جو کچھ سیکھا ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے —— غور سے سنو، سب سے ضروری بات یہ ہے کہ تمہیں پاگلوں سے محبت کرنی چاہیئے۔

تنویر: میں اس بات پر حیران ہوں کہ آخر اس مقصد کو پاگل پن سے کیا واسطہ ہے۔ مجھے شادی کرنا ہے۔ کسی پاگل کا علاج تو نہیں کرنا —— آپ کو نہ جانے کیا غلط فہمی ہو گئی ہے!

ہ صاحب: شادی —— شادی بھی ہو گی اور ضرور ہو گی۔ شادی کے لیے ہنر کی ضرورت ہے۔ میرے بیٹے سنو، پاگل سے نفرت نہ کرو، یہ پہلی اور بنیادی چیز ہے۔ اس بنا پر اسد اللہ غالب سے مجھے گہری ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ اور میں نے اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جو اس گہری ہمدردی اور محبت کا نتیجہ تھا۔ میں نے اس سے کہنا شروع کر دیا۔ تم واقعی بے نظیر شاعر ہو۔ اس وقت ساری دنیا میں تم جیسا

کوئی شاعر نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگا۔
دوسری بات یہ ہے۔

تنویر: معاف کیجئے قبلہ ڈاکٹر صاحب! اگر شادی کے لیے پاگلوں کا ڈاکٹر بننا
ضروری ہے تو میں بصد حسرت و یاس استعفٰی پیش کرتا ہوں ——۔
میرا استعفٰی قبول کیجئے۔ آداب عرض!

وہ صاحب: (غصے سے) بے وقوف مت بنو! تم نہیں جانتے اس وقت
کتنا قیمتی موقع ہاتھ سے کھو رہے ہو۔ تمہاری بے صبری عقل و
دانش کے ایک بہت بڑے خزانے سے تمہیں محروم کر رہی ہے۔
برخوردار!

تنویر: بہرحال میں مجبور ہوں۔

وہ صاحب: مجبور۔؟ (قہقہہ) دنیا میں مجبوری اپنی کمزوری کا نام ہے آہا!
—— بے وقوف کہتا ہے مجبوری Stand up on
The Bench سنا نہیں Stand up on the
chair —— تم جیسے نالائقوں نے علم و ہنر کو بدنام کر دیا
ہے۔ پہلی ہی منزل پر تمہارا یہ حال ہے تو آئندہ کیا کرو گے۔ خیر!
تم خواہ کسی قدر بے چینی اور بے صبری کا اظہار کرو۔ میں تمہیں راہ راستی
سے بھٹکنے نہیں دوں گا —— تمہیں عقل و شعور سے بہرہ ور کرنا تم پہ

ظلم ہے۔ میں تم پر ظلم نہیں ہونے دوں گا۔

نویر: مجھے معاف کیجئے جناب! —— میں عقل و شعور سے باز آیا۔

ہ صاحب: ہرگز نہیں —— کبھی نہیں —— ٹھہرو —— میں تمہیں پہلے تھوڑی سی سزا دے لوں۔ اس کرسی پر کھڑے ہو جاؤ (گرج کر) کھڑے ہو جاؤ۔ —— سُنا نہیں تم نے میں کیا کہہ رہا ہوں؟ اس کرسی پر کھڑے ہو جاؤ!

نویر: آپ کیا کر رہے ہیں ——؟ یہ کیسی عجیب و غریب حرکت ہے —— معاف کیجئے یہ —— آپ بزرگ ہیں ورنہ میں کہتا یہ بالکل بچپن ہے بلکہ حماقت ہے —— اچھا آداب عرض!

ہ صاحب (تنویر کو پکڑ کر) بھاگنا چاہتے ہو —— اتنا بڑا مقصد لے کر آئے تھے۔ اور حالت یہ ہے کہ ابتدا ہی میں گھبراہٹ کا شکار ہو گئے ہو۔ کرسی پر کھڑے ہو جاؤ۔ میں نے تمہیں جکڑ لیا ہے۔ تم نہیں جا سکتے!

تنویر: قبلہ میرا ہاتھ تو چھوڑیئے! —— اُف میرا ہاتھ تو چھوڑ دیجئے —— یہ کیا بچپن ہے!

ہ صاحب: میں تم جیسے نالائق لوگوں کے ارادوں سے خوب واقف ہوں —— اچھا اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ میں اپنا پہلا لیکچر شروع کرتا ہوں —— کاغذ کہاں ہے؟ قلم کدھر ہے۔ میں پوچھتا ہوں تم لینے کیا آئے ہو؟

نویر: میں کاغذ پنسل لے کر ابھی حاضر ہو جاتا ہوں جناب! تھوڑی دیر کے لیے

اجازت دیجئے!

وہ صاحب: کاغذ پنسل کی قطعاً ضرورت نہیں۔ کیونکہ آج میں جو کچھ بتانے والا ہوں وہ بالکل ابتدائی باتیں ہیں۔ بالکل ابتدائی باتیں۔ یوں سمجھو علم کے سمندر کے چند قطرے ہیں۔ جیسے جیسے تمہارا شوق بڑھتا جائے گا۔ یہ قطرے لہریں بن جائیں گی۔ پھر ان لہروں میں طوفانی کیفیت آجائے گی۔ اور پھر ——— اور پھر تم بھی اُس منزل پہ پہنچ جاؤ گے جس منزل پر میں ہوں میں پیشگوئی کرتا ہوں کہ تم اس منزل پر ضرور پہنچو گے ——— ضرور پہنچو گے آخر کیوں نہ پہنچو گے ——— میں پوچھتا ہوں کیوں نہ پہنچو گے؟

تنویر: مگر جناب! میرا ہاتھ تو چھوڑ دیجئے۔ آخر آپ نے اس طرح میرا ہاتھ کیوں پکڑ رکھا ہے ——— ؟

وہ صاحب: بعض لوگ کہتے ہیں پاگلوں کو کنٹرول میں رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن میرا تجربہ ہے بے صبر شاگردوں کو صبر و تحمل سکھانا اس سے زیادہ مشکل کام ہے ——— عقل و دانش کے چشمے پر پہنچ کر پیاسے ہی لوٹ جانا چاہتے ہو۔ یہ کس قدر عظیم الشان حماقت ہے۔ تم یہ پاگل پن ہرگز نہیں کر سکتے ——— میں تمہیں اس پاگل پن کی کبھی اجازت نہیں دے سکتا!

تنویر: آپ درست فرماتے ہیں قبلہ! واقعی مجھے یہ حماقت ہرگز نہیں کرنی چاہیئے میں ضرور اُس منزل پہ پہنچوں گا جس منزل پر آپ پہنچ چکے ہیں۔ اب تو

آپ مطمئن ہو گئے نا!

وہ صاحب: میری پیشین گوئی صحیح ثابت ہو رہی ہے ۔۔ میرے ہونہار شاگرد! میں تمہارے سر پر ابھی دستِ شفقت پھیرتا ہوں۔

تنویر: تو قبلہ! یوں کیجئے میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے۔ آپ کے سامنے بیٹھ جاتا ہوں۔ —— اور پھر میرے سر پر دستِ شفقت بھی تو پھیریئے۔

وہ صاحب: (مشفقانہ انداز میں) برخوردار! میری سب سے بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ جو شخص بھی اس کمرے میں قدم رکھے۔ وہ میرے تجربات سے پوری طرح فائدہ اٹھا کر ایک بہت بڑا ڈاکٹر بن جائے۔ مگر آج تک کسی شخص کو بھی علم کے اس سرچشمے سے سیراب ہونے کی توفیق نہیں ہوئی۔ تم پہلے شخص ہو جس کے بارے میں میں پوری تسلی کے ساتھ پیشین گوئی کر سکتا ہوں کہ تم عنقریب میرے جانشین مقرر ہو گے۔ تو برخوردار! —— (محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) میرے دستِ شفقت کی لاج رکھنا بیٹا! اب میں اپنا اصل فرض ادا کرتا ہوں۔

تنویر: جی، بہت بہت شکریہ!

وہ صاحب: —— فرزندی کا —— معاملہ بھی ہے! خیر، خیر، میں اس کے بارے میں گفتگو کرتا ہوں!

تنویر: قبلہ! اب ہاتھ آزاد کر دیجئے نا! ذرا میں وہ کرسی گھسیٹ کر ادھر لے

آدمیوں کی بھوما ہے

آؤں۔

وہ صاحب: ضرور

تنویر: شکریہ!

(وہ صاحب تنویر کا ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ تنویر دروازے کی طرف جاتا ہے۔ اور باہر نکل جاتا ہے۔)

وہ صاحب: ارے — او بدقسمت! — میری پیشین گوئی — او نالائق۔ ٹھہر جا! رُک جا! — ٹھہر جا۔ او — کمبخت میں نے تمہارا نام بھی نہیں پوچھا تھا۔

(تنویر دروازے سے نکل جاتا ہے)

دوسرا منظر

منظر: تنویر کا مکان

(تنویر اپنے کمرے میں صوفے پر سر نیہوڑائے بیٹھا ہے۔ دائیں ہاتھ کی انگلیاں پیشانی پر جمی ہیں۔ خورشید جنوبی دروازے کا پردہ ہٹا کر اندر آتی ہے۔ دو قدم چل کر رُک جاتی ہے۔ اور وہیں سے سرد لہجے میں کہتی ہے:)

خورشید: بھائی جان! ہو گئی ملاقات ہونے والے خسر سے ——— (وقفہ) بولتے
نہیں بھائی جان!

(آگے بڑھ کر تنویر کے پاس آ کر رک جاتی ہے۔ اور حیرت سے تنویر
کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔ تنویر ابھی اسی کیفیت میں ہے ———)

یہ ——— یہ کیا ہے بھائی جان؟ اس طرح کیوں بیٹھے ہیں؟

تنویر: خورشید! اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دو۔

خورشید: مگر کیوں؟ آپ گئے نہیں وہاں ——— اپنے ہونے والے خسر کے
پاس ——— ہیں بھائی جان!

تنویر: اس معاملے میں میں کچھ نہیں سننا چاہتا ——— کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

خورشید: آپ وہاں نہیں گئے ——— تو کہاں چلے گئے تھے؟ یہ کیا حالت بنا رکھی
ہے؟ بال بکھرے ہوئے، چہرہ افسردہ۔ یا اللہ! معاملہ کیا ہے؟

تنویر: وہیں سے ہو کر آ رہا ہوں۔

خورشید: کہاں سے؟

تنویر: کہہ تو دیا، جہاں تم لوگوں نے بھیجا تھا!

خورشید: نگہت کے ابا کے پاس؟ مگر ——— مگر ——— کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ماجرا
کیا ہے؟

تنویر: ایک مرتبہ اور ان سے ملاقات ہو جاتے تو پھر مجھے یہاں نہیں دیکھو گی

خورشید: تو کہاں دیکھوں گی؟

تنویر: پاگل خانے میں!

خورشید: ہائے اللہ آپ کو کیا ہو گیا ہے —— آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ گھر سے تو بہت خوش خوش گئے تھے۔

تنویر: اب تک پانی کے تین گلاس سر پر ڈال چکا ہوں۔

خورشید: کیوں؟

تنویر: ان محترم کی باتوں نے عقل کی اتنی حرارت میرے اندر بھر دی ہے، کہ میں بے اختیار پگھلا جا رہا ہوں۔ میرے دماغ سے شعلے نکل رہے ہیں، دل سے چنگاریاں نکل رہی ہیں! اور بھی کچھ سننا چاہتی ہو؟

خورشید: آپ کن کی باتیں کر رہے ہیں —— آپ کہاں گئے تھے؟

تنویر: کہا نہیں، جہاں تم لوگوں نے مجھے بھیجا تھا۔

خورشید: لیکن —— آپ کہہ کیا رہے ہیں؟ نگہت کے ابا جان کی باتیں میں نے اگرچہ کبھی نہیں سنیں۔ مگر جس باپ کی بیٹی اتنی ذہین، عقل مند اور ——

تنویر: میں تو ساری عمر میں کبھی —— اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گا —— وہ شخص تو خطرناک قسم کا پاگل ہے ——

خورشید: خطرناک قسم کا پاگل؟

تنویر: سخت خطرناک قسم کا پاگل! اس کے بعد میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ وہ ظاہر

ہے!

خورشید: نگہت کے ابا جان پاگل ہیں ——— یہ میں کیا سن رہی ہوں؟

تنویر: تم نے دیکھا ہے انہیں کبھی ——— ان کی باتیں سنی ہیں کبھی؟

خورشید: نہیں! ——

تنویر: تو جاؤ اب۔

خورشید: امی سے کہتی ہوں۔

(خورشید چلی جاتی ہے۔ تنویر وہیں صوفے پہ بیٹھا رہتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد سگریٹ سلگا کر اس کے لمبے لمبے کش لینے لگتا ہے ——

خورشید اور امی آتی ہیں۔)

امی: تنویر بیٹا! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟

تنویر: امی خورشید نے جو کچھ کہا ہے درست ہے۔

امی: نگہت کی پھوپھی کو میں جانتی ہوں۔ ذرا خوش مذاق ہے۔ اس کا بھائی بھی خوش مذاق ہوگا!

تنویر: امی! کیا آپ سمجھتی ہیں میں خوش مذاقی اور پاگل پن میں تمیز نہیں کر سکتا

امی: میں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اگر تو یہاں شادی نہیں کرنا چاہتا تو اور بات ہے۔ پہلے کہہ دیا ہوتا۔ میں خواہ مخواہ قول اقرار کرتی پھری آج نگہت کے ابا نے بلایا ذرا مل جاؤ ——— تو بس کہہ دیا وہ خطرناک

پاگل ہے۔ آجکل کے لڑکوں کے سامنے ہم بڈھوں کی پیش نہیں چلتی

بابا! ——

تنویر: امی! آپ کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ وہ —— میں بالکل صحیح کہتا ہوں۔ ان کی باتوں سے عجیب خوفناک قسم کا پاگل پن ٹپکتا ہے —— بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگا ہوں وہاں سے —— میں ——

امی: (الفاظ کاٹ کر) چلو خورشید! یہ جانے اور اس کا کام۔ آئندہ اس کی بات میں جو دخل دے اس پر لعنت۔ آج تک کسی نے اشارہ تک نہیں کیا تھا کہ نگہت کا والد پاگل ہے۔ استغفراللہ!

تنویر: مگر امی جان! —— آپ ایک مرتبہ ان کی باتیں سن لیجئے پھر کہئے۔ ایسی اوٹ پٹانگ باتیں تو میں نے آج تک کسی سے نہیں سنی تھیں!

امی: اب کیا کہیں گے نگہت کی ماں سے —— یہ تو پہلے ہی کہتا تھا۔ میں نہیں جاتا ہوں۔

تنویر: وہ تو صرف اس لئے کہ مجھے شرم آتی تھی وہاں جاتے ہوئے۔

امی: جی ہاں —— شرم آتی تھی —— چلو خورشید!

تنویر: عجیب مصیبت ہے —— آخر کیا کروں —— امی! دیکھئے —— امی بات تو سنئے میری!

(ماں بیٹی چلی جاتی ہیں۔ تنویر فرطِ اضطراب میں کمرے کے اندر

ٹہلنے لگتا ہے —— نوکر آتا ہے)

نوکر: ایک صاحب آئے ہیں۔

تنویر: کیا؟

نوکر: ایک صاحب آئے ہیں جناب!

تنویر: ایجنٹ ہوگا، بیمہ کمپنی کا —— کہدو طبیعت خراب ہے۔

نوکر: جی

تنویر: سنا نہیں تو نے۔ کہہ دو طبیعت خراب ہے۔

نوکر: یہ بات تو میں کہہ چکا ہوں جناب!

تنویر: تو پھر؟

نوکر: وہ کہتے ہیں صرف ایک منٹ ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ اور جناب! وہ کوئی ایجنٹ نہیں معلوم ہوتے۔

تنویر: ہیں؟

نوکر: مگر کوئی بڑے اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

تنویر: مگر میں اس وقت کسی اچھے آدمی سے بھی نہیں مل سکتا —— اچھا لے آؤ انہیں یہیں۔

(نوکر چلا جاتا ہے، اور چار لمحوں کے بعد نوکر کے ساتھ ایک صاحب آتے ہیں۔ سن پچاس کے قریب ہوگا۔ داڑھی فرنچ کٹ۔ درمیانہ قد و قامت الباس اور صحت کے لحاظ سے خوشحال طبقے کے فرد نظر آتے ہیں)

نووارد: معاف کیجیے۔ آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔

تنویر: کوئی بات نہیں فرمائیے!

نووارد: آپ بہت پریشان معلوم ہوتے ہیں اور آپ کو پریشان ہونا بھی چاہیے معاملہ ہی کچھ اس قسم کا ہوا ہے۔

تنویر: آپ کی تعریف ----؟ اس سے پہلے کبھی آپ سے شرف نیاز حاصل نہیں ہوا

نووارد: آج ہو جاتا۔ مگر آپ غریب خانے پر پہنچے ہی نہیں۔

تنویر: کیا فرمایا؟

نووارد: آج دیر تک آپ کا انتظار کرتا رہا

تنویر: آپ ---؟

نووارد: میرا نام عبدالقیوم ہے --- نگہت کا والد!

تنویر: آپ --- ان کے والد صاحب --- مگر --- عجیب معاملہ ہے۔ میں تو وہاں گیا تھا۔

نووارد: بیٹا! تم میرے یہاں آنے کی بجائے میرے ہمسائے کی کوٹھی میں چلے گئے تھے۔ وہاں تمہیں یقیناً بہت دلچسپ اور شاندار تجربہ ہوا ہوگا جس صاحب سے تمہاری ملاقات ہوئی ہے۔ وہ پاگلوں کے ڈاکٹر رہ چکے ہیں۔ اور بدقسمتی سے خود بھی پاگل ہو گئے ہیں جو صاحب ان کے یہاں چلے جاتے ہیں۔ آسانی سے ان کا پیچھا چھوڑتے نہیں۔

تنویر: تو وہ سچ مچ پاگل ہیں؟

نو وارد: کیا اس تجربے کے بعد بھی اس معاملے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نکل سکتی ہے؟ میں تمہارا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو چکا تھا۔ کہ میرا چھوٹا بیٹا بھاگا بھاگا آیا۔ اُس نے اطلاع دی کہ تم ڈاکٹر پاگل کے شکنجے میں پھنسے ہوئے ہو۔ جب تک میں ادھر آؤں۔ تم خدا جانے بھاگ کر وہاں سے غائب ہو گئے تھے یا کیا ہوا تھا۔ بہر حال تم وہاں تھے نہیں۔ اب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ میں خود ہی ادھر آؤں —— تم کو چاہیئے تھا، کوٹھی میں داخل ہوتے وقت کوٹھی کا نمبر تو دیکھ لیتے۔ ۶ کی بجائے تم ۹ نمبر میں چلے گئے۔

تنویر: مجھے تو یہی بتایا گیا تھا کہ وہ سُرخ رنگ کی کوٹھی ہے۔

نو وارد: وہاں تو سب کی سب سُرخ رنگ کی کوٹھیاں ہیں —— ہاں یہ بتاؤ اتنی جلدی غائب کیونکر ہو گئے تھے؟

تنویر: میں —— جناب بھاگ نکلا وہاں سے۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ چھوڑتے ہی نہیں تھے

نو وارد: جو بھی جاتا ہے اُدھر اُسی کو اپنا شاگرد بنا لیتے ہیں —— اچھا اب میں چلتا ہوں۔

تنویر: بیٹھئے تو سہی قبلہ! امی کو اطلاع دیتا ہوں۔ وہ بڑی پریشان ہیں۔

نووارد: انہیں ساری بات بتا دونا —— تم سے ملاقات تو ہو گئی ہے۔ خدا حافظ!

(نووارد چلا جاتا ہے۔ تنویر جذبات کی شدت میں ٹہلنے لگتا ہے۔ خورشید آتی ہے۔ اُس کا چہرہ بہت مایوس ہے ——)

تنویر: کیوں خورشید؟

خورشید: بھائی جان! کیا نگہت کے آبا جان سچ مچ —— میرا مطلب ہے پاگل ہیں؟

تنویر: اگر تم ایک منٹ پہلے آجاتیں تو یہیں انہیں دیکھ سکتی تھیں۔

خورشید: یہیں؟ آج آپ پہیلیوں میں کیوں باتیں کر رہے ہیں!

تنویر: بالکل سچ کہتا ہوں —— !

خورشید: کبھی کہتے ہیں نگہت کے آباجی پاگل ہیں۔ اور کبھی فرماتے ہیں وہ یہیں تھے

تنویر: خورشید! میں ایک پاگل سے ضرور ملا ہوں —— مگر وہ نگہت کے آبا نہیں ہیں —— نگہت کے آبا خود یہاں آئے تھے ——

خورشید: سچ؟

تنویر: ہاں —— !

خورشید: کہوں آتی ہے ہے ——

(خوشی سے بھاگ کر باہر نکل جاتی ہے۔ تنویر بھی اُس کے پیچھے کمرے سے نکل جاتا ہے)

کسی کی یاد

منظر

نزہت کا کمرہ۔ وسط میں ایک میز کے اوپر شگفتہ اور رنگا رنگ پھولوں سے لدے ہوئے گلدان پڑے ہیں۔ میز کے بالمقابل شمالی دیوار میں ایک دروازہ ہے جس کا ایک پٹ بند ہے۔

اس وقت شام ہو چکی ہے۔ چودھویں کے چاند کی سیمیں کرنوں کا سیلاب، روشن دانوں اور کھڑکیوں میں سے اندر داخل ہو کر فضا میں پھیل گیا ہے۔ میز سے کچھ دور صوفے پر نزہت بیٹھی ہے۔

اس کی نگاہیں صوفے کے بازو پر جمی ہیں۔ اور سر جھکائے کسی کی یاد میں غرق ہے

نزہت اکیس بائیس برس کی خوبصورت لڑکی ہے۔ بدن چھریرا، قد لمبا اور چہرے کے نقوش کافی دلآویز ہیں۔ لباس کے معاملے میں خاص تکلف اور نفاست سے کام لیتی ہے۔ اس وقت وہ نیلے بارڈر والی ہلکے گلابی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس ہے۔

نزہت کمرے میں تنہا ہے کچھ سوچتے ہوئے وہ اپنا سر صوفے کی پشت سے لگا دیتی ہے اور آہ بھر کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔

دروازے میں سے منزہ داخل ہوتی ہے۔ منزہ اس کی ہم عمر ہے

نظروں اور ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ پھیلی ہوئی ہے۔ منزہ اپنے بھائی عقیل کے ساتھ نزہت کے یہاں مہمان ہے۔ اور رشتے میں نزہت کی خالہ زاد بہن ہے۔ تعلیم اور خاندانی ثروت کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے مگر طبیعت کے لحاظ سے دونوں بہنیں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ نزہت کی طبیعت رومانی رجحان کی وجہ سے شاعرانہ افسردگی میں ڈوبی رہتی ہے۔ اس کے برعکس منزہ ایک حقیقت پسند لڑکی ہے۔

منزہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے صوفے کے پاس پہنچتی ہے نزہت بدستور آنکھیں بند کئے اپنے تصور میں غرق ہے۔

منزہ، نزہت کے پہلو میں بیٹھ جاتی ہے اور مصنوعی انداز میں آہ بھر کر مشفقانہ طریقے سے نزہت کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگتی ہے نزہت آنکھیں کھول دیتی ہے اور منزہ کا ہاتھ پرے ہٹا دیتی ہے۔

منزہ: ہائے یہ چاہت بھی کیا مصیبت ہے۔ سوائے کسی کی یاد کے دل کسی طرح بہلتا ہی نہیں۔

نزہت: مہربانی کر کے تشریف لے جایئے۔ مجھے تنہائی چاہیئے۔ دیکھتی نہیں ہو کچھ سوچ رہی ہوں۔

منزہ: جو کچھ سوچ رہی ہو، وہ مجھے خوب معلوم ہے جناب!

نزہت: خدا کے لیے چلی جاؤ۔ اس طرح پریشان کر کے تمہارے ہاتھ کیا آئے گا

(آہ بھرتی ہے)

منزہ: ہائے اللہ آہیں تو نہ بھرو۔ ابھی ابھی باورچی خانے سے اٹھ کر آ رہی ہوں۔

نزہت: اس طرح مذاق اڑاتے تجھے شرم تو نہ آتی ہوگی۔

منزہ: تم تو خواہ مخواہ بگڑ گئیں (نزہت کا سر گود میں لے کر) میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ گرمی میں سے آئی ہوں۔ یہاں تم آہوں کی حرارت پھیلانے لگی ہو بھلا اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے اکھڑنا۔

نزہت: (منزہ کی باہیں پیچھے ہٹاتے ہوئے) میں کہتی ہوں یہاں سے جا نہیں سکتیں تم

منزہ: دو چار باتیں کر کے چلی جاؤں گی۔

نزہت: میں ایک بات بھی سننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

منزہ: او ہو! اس قدر بگڑ گئیں۔ محبت نے تمہیں چھوئی موئی بنا دیا ہے۔

نزہت: میں جو کچھ ہوں اور جس حالت میں ہوں ٹھیک ہوں۔ تمہیں کیا غرض ہے مجھ سے؟

منزہ: ذرا بات تو سنو میری نزہت! سنو گی بھی یا بگڑتی ہی چلی جاؤ گی۔ سچ کہتی ہوں مجھ سے تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ بھلا یہ بھی کیا محبت ہوئی کہ آدمی ہر وقت کسی کی یاد ہی میں کھویا رہے۔ کیا خبر حشمت کو تمہارا خیال تک بھی نہ ہو۔ مگر ادھر تم ہو کہ ہر گھڑی شمع کی طرح اس کی محبت میں پگھلتی جا رہی ہو۔

نزہت: کم بخت تجھے ان باتوں کی کیا خبر؟

نزہ: جی ہاں! میں تو محبت کے فلسفے سے بالکل بے بہرہ ہوں۔ محبت کی گہرائیوں سے تو تم ہی واقف ہو مگر خدا کے لیے کبھی ہم سے بھی مل جل کر باتیں کر لیا کرو تو یہ گھڑی کس قدر منحوس ہوتی ہے۔ جب کسی کا کسی پہ دل آجاتا ہے

زہت: (سنبھل کر بیٹھتے ہوئے) میں تم جیسی بدمذاق کو کس طرح سمجھاؤں۔ کہ زندگی کے وہ لمحے سب سے قیمتی ہوتے ہیں۔ جب شروع شروع میں دل کی گہرائیوں میں محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

نزہ: تو یہی جذبہ پھر پیدا کر لو۔ حشمت تو شاید تمہیں بھول چکا ہے۔

زہت: محبت کی توہین کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ محبت زندگی میں صرف ایک بار ہوتی ہے اور جب یہ آگ ایک مرتبہ بھڑک اٹھتی ہے تو آخری سانس تک بھڑکتی رہتی ہے۔ جاؤ دفع ہو جاؤ میرے دل کو سخت ضرب پہنچائی ہے تم نے

نزہ: اگر یہ بات ہے تو میں خلوصِ دل سے معافی مانگ لیتی ہوں۔ کہو تو محبت کی بارگاہ میں پشیمانی کے آنسوؤں کے موتی بکھیر دوں۔

(اس طرح منہ بنا لیتی ہے جیسے ابھی رو پڑے گی)

زہت: دوسرے کے دل کو ٹھیس پہنچانا تمہارے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے، کاش ——

نزہ: خدا کے لیے یہ جدو جانے دو۔ محبت کے تجزیے مجھ سے تو کبھی برداشت

نہیں ہوں گے۔ اچھا یہ کہو، اگر حشمت صاحب جلد ڈھاکہ سے نہ آئے تو کیا اسی طرح کڑھتی رہو گی ۔۔۔۔ اسی طرح گھل گھل کر اپنے آپ کو ختم کر دو گی؟

نزہت : (منزہ کی طرف مایوسانہ دیکھ کر) ابھی تو میں گھٹتی ہوں۔ محبت کی آگ صرف ایک مرتبہ بھڑکتی ہے۔ اور ہمیشہ بھڑکتی رہتی ہے۔

منزہ : نزہت! اپنے اوپر رحم کرو۔ اپنے اوپر رحم نہیں کرتیں تو مجھ پر رحم کرو۔ تم جانتی ہو، مجھے تم سے کتنی گہری محبت ہے۔ خدانخواستہ اگر تمہارے ساتھ ایسی ویسی بات ہو گئی تو میں کیا کروں گی ۔۔۔ میں کدھر جاؤں گی۔ کیا سر پھوڑنے کے لیے کوئی اور سنگِ آستاں نہیں ملتا تمہیں؟

نزہت : (بے تابانہ شدت سے) مجھے تنہا چھوڑ دو اس وقت (رومال سے آنسو پونچھتی ہے) ۔۔۔ میری محبت کا ۔۔۔ میرے غم کا بے رحمی سے مذاق اڑایا جاتا ہو

منزہ : نہیں میری بہن! اللہ کرے حشمت لنگڑا ہو جائے، لولا ہو جائے، اور اُسے فوراً فوج سے جواب مل جائے؟ اس وقت۔ تو آئے گا نا میری بہن کو کیا حال کر دیا ہے ظالم نے (نزہت کی پیشانی چومتی ہے) ان مردوں کو عورتوں کے نازک دلوں پہ ذرا رحم نہیں آتا۔ تمہاری بجائے میں ہوتی تو فوراً ۔۔۔

نزہت : (منزہ کے الفاظ کاٹ کر) تم تو میرے غم کا مذاق اڑاتی ہو۔

منزہ : ہائے اللہ اس میں مذاق کی کیا بات ہے۔ میں نے یہی کہا ہے نا حشمت صاحب کس طرح جلد سے جلد آ جائیں۔ جب تک وہ نہ آئیں گے۔ تمہارے لیے

چاندنی چھٹکی رہے گی، پھول خوشبو سے محروم رہیں گے اور دنیا پہ ہمیشہ اندھیری رات ہی چھائی رہے گی۔ (چونک کر) اوہ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا گھر کے سب لوگ سیر کے لیے جا رہے ہیں۔ چلو گی ہمارے ساتھ؟

زہت: نہیں، دل نہیں چاہتا۔

نزہ: نہیں بی تمہیں چلنا ہی پڑے گا۔ کیا کہیں گے یہ لوگ۔ سوچو تو بھی اس نگوڑی محبت نے تمہیں کیا سے کیا بنا دیا ہے۔

زہت: جب دل ہی بجھ گیا ہو اس وقت سیر بھی معلوم نہیں ہوتی۔

نزہ: ذرا چلو تو سہی تھوڑی دیر کے لیے دل بہل جائے گا۔

زہت: نہیں بہن! مجھے معاف ہی کر دو۔

نزہ: تو یہاں بیٹھ کر آنسو بہاتی رہو گی؟

زہت: جو دل میں دعا کروں گی مگر جاؤں گی نہیں۔ ہجوم سے تو وحشت ہوتی ہے مجھے۔

نزہ: نہیں چلو گی نزہت!

زہت: ہرگز نہیں۔

نزہ: عجیب مصیبت ہے۔ اچھا بابا! مجبوری سہی۔

(منزہ چلی جاتی ہے۔ منزہ کے جانے کے بعد نزہت سر جھکا کر رومال بائیں ہاتھ کی انگلی کے گرد لپیٹنے لگتی ہے۔ سر کوچ کے بازو پہ ٹکا کر نیم دراز ہو جاتی ہے اور گنگنانے لگتی ہے۔

کسی کی یاد

تیرے تیر نیم کش کو کوئی میرے دل سے پوچھے
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

دو تین مرتبہ یہی شعر گنگناتی ہے۔ پھر خاموش ہو جاتی ہے۔ کسی قدر دور سے وائلن کی آواز آتی ہے اور آہستہ آہستہ قریب آنے لگتی ہے

عقیل دروازے پر آتا ہے۔ عقیل میرج پچیس برس کا جوان ہے چہرے کا رنگ سانولا ہے۔ ہرن کی طرح قد لمبا ہے چہرے کے نقوش بتا رہے ہیں کہ کافی ذہین ہے۔ خوبصورت تو نہیں مگر بدصورت بھی نہیں ہے۔ نیلے رنگ کی پتلون اور سفید قمیص میں ملبوس ہے۔ ہاتھ میں وائلن ہے۔

دروازے پر آکر رک جاتا ہے۔ نزہت اپنے تصور میں غرق ہے۔ اسے عقیل کی موجودگی کا علم نہیں۔ عقیل وائلن بجانے لگتا ہے نزہت چونک کر اس کی طرف دیکھتی ہے۔ اور صوفے سے اٹھ کر ساڑھی ٹھیک کرنے لگتی ہے اور عقیل کی طرف اس انداز سے دیکھنے لگتی ہے۔ جیسے پوچھ رہی ہو "تمہارے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے" ــــ عقیل وائلن بند کر دیتا ہے۔)

عقیل : معاف کیجئے۔ اتفاقاً ادھر سے گزر رہا تھا کہ آپ پر نظر پڑ گئی۔

نزہت : جی۔

عقیل : گھر کے سب لوگ تو چاندنی میں سیر کا لطف اٹھانے کے لیے باہر گئے

ہیں۔ آپ اکیلی کیوں بیٹھی ہیں یہاں؟

زہت: یونہی۔

عقیل: مجھے پوچھنے کا کوئی حق تو نہیں ہے۔ تاہم اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہونی چاہیئے۔

زہت: کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔

عقیل: میرا مطلب ہے کہیں خدا نخواستہ طبیعت تو ناساز نہیں ہے۔ آج کل موسم کافی خراب ہے۔

زہت: نہیں۔

قیل: یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔

زہت: جی

قیل: حیرت ہے وہ اب جھوٹ بھی بولنے لگی ہے۔

زہت: کون؟

قیل: میری چھوٹی بہن منزہ۔

ہت: (زرا گھبرا کر) کیا کہا اس نے؟

(عقیل اندر آتا ہے اور نزہت کے پاس آکر رک جاتا ہے۔ دائیں میز پر رکھ دیتا ہے)

قیل: (پھولوں کو دیکھتے ہوئے) کتنے خوبصورت پھول ہیں۔ شاید ابھی ابھی باغ سے لائے گئے ہیں۔

نزہت: (بڑی سنجیدگی) عفترہ نے میرے بارے میں کیا کہا ہے آپ سے؟

عقیل: کوئی خاص بات نہیں۔

نزہت: پھر بھی۔

عقیل: میں نے پوچھا۔ گھر کے سب لوگ جا رہے ہیں سیر کو۔ کہنے لگی۔ نزہت نہیں جا رہیں۔ اُن کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ اب آپ فرماتی ہیں میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔

نزہت: آفت کی پرکالہ ہے یہ لڑکی۔

عقیل: جی ہاں، میں آپ کی تائید کرتا ہوں۔ اتنی شریر ہے کہ کیا کہوں۔ مگر ایک بات آپ بھی مانیں گی۔ عام شریر لڑکیوں سے کافی مختلف ہے میری بہن میرا مطلب ہے بڑی ذہین شریر ہے۔ اس کی شرارتوں میں بڑی ذہانت ہوتی ہے۔

نزہت: (ذرا مسکرا کر) ہو سکتا ہے۔

عقیل: معلوم ہوتا ہے آپ کو میرے خیال سے اتفاق نہیں ہے۔

نزہت: آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

عقیل: غلط فہمی؟

نزہت: جی ہاں۔

عقیل: آپ کو تعجب ہوگا یہ سن کر کہ مجھے عام طور پر غلط فہمی ہوتی رہتی ہے۔

زہت: (ذرا اشتیاق سے) اچھا

عقیل: عجیب طبیعت لے کر آیا ہوں دنیا میں۔

زہت: دنیا میں ہر شخص اپنے بارے میں کچھ اسی قسم کی رائے قائم کر لیتا ہے

عقیل: (یہ بھی درست ہے۔ معاف کیجئے، آپ کی اپنی ذات کے متعلق بھی غالباً یہی رائے ہو گی۔

زہت: (گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے) آپ ان لوگوں کے ساتھ گئے نہیں۔

عقیل: سیر کے لیے؟

زہت: جی۔

عقیل: انہوں نے کہا تھا۔ مگر میں نے دردِ سر کا بہانہ کر کے ٹال دیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہجوم کے ساتھ باہر جاتے ہوئے میری طبیعت گھبراتی ہے۔ اور جب پارٹی میں بچوں کی ٹولی ایک اچھی خاصی فوج موجود ہو تو چاندنی کا کیا لطف آ سکتا ہے؟

زہت: آپ درست فرماتے ہیں۔

عقیل: شکریہ ——— میرا خیال ہے چاندنی رات میں سیر کا لطف اس وقت آتا ہے جب آدمی تنہا ہو یا اس کے ساتھ کوئی ایسا با ذوق شخص موجود ہو جو باتیں نہ کرے۔ میرا مطلب ہے باتونی نہ ہو۔ بعض لوگوں کو تو میں نے ایسے عالم میں بھی لمبی چوڑی گفتگو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کچھ نہ پوچھئے، باتونی آدمی

سے تو میں بے حد گھبراتا ہوں۔

نزہت: اپنی اپنی طبیعت ہوتی ہے۔

عقیل: آپ باتونی آدمی سے پریشان نہیں ہو جاتیں؟

نزہت: میں تو تنہائی پسند ہوں۔

عقیل: میرا بھی یہی حال ہے۔ مگر منزہ کا نہیں۔ خدا کی پناہ! ایک لمحے کے لیے بھی خاموش نہیں بیٹھے گی۔ اور کچھ نہیں تو گڈے ہی سے باتیں کرنے لگے گی۔

نزہت: گڈے سے؟

عقیل: گڈا ہمارے پرانے کتے کا نام ہے — معاف کیجیے میری موجودگی میں آپ پریشان تو نہیں ہو گئیں۔ میرا مطلب ہے، ممکن ہے اس وقت آپ تنہا رہنا پسند کرتی ہوں۔

نزہت: کوئی مضائقہ نہیں۔

عقیل: میرا مطلب ہے اگر آپ کہیں تو چلا جاؤں۔

نزہت: میرا مطلب ہے آپ تشریف لے آئے ہیں۔ تو بیٹھ جائیں چند منٹ کے لئے۔

عقیل: (مسکرا کر) خوب۔ یہ میرا تکیہ کلام ہے (کوچ پر بیٹھ جاتا ہے) اور آپ کھڑی رہیں گی؟

نزہت : (کوچ کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے) آپ کے سر میں درد ہے؟

عقیل : جی۔ درد۔ درد تو ہے نہیں یونہی بہانہ کیا تھا۔

نزہت : آخر منزہ ہی کے بھائی ہیں نا آپ؟

عقیل : حیرت ہے۔ آپ کو اس میں بھی شرارت کی بات نظر آتی ہے۔

نزہت : نہیں تو۔

عقیل : میں محسوس کر رہا ہوں، آپ بڑے تکلف سے کام لے رہی ہیں۔ خیر صرف چند لمحے ٹھہروں گا یہاں۔ اب وہ لوگ کافی دور جا چکے ہوں گے۔ آزادی کے ساتھ گھوم سکوں گا۔ یہاں کی چاندنی راتیں کافی حسین ہیں۔ ملتان میں تو ایسے شاعرانہ ماحول کو ترس گیا تھا۔

نزہت : ملتان میں۔

عقیل : (ہنس کر) میرا مطلب ہے۔ وہاں ابا جان پر ہماری صحت کا خیال اس طرح چھایا رہتا ہے کہ وہ رات کو باہر نکلنے ہی نہیں دیتے۔ ذرا جاگ کر باہر جانے کا ارادہ کروں تو فوراً ٹوک دیں گے۔ سو رہو بیٹا، رات خدا نے آرام کے لیے بنائی ہے۔

نزہت : میں نے بھی ان کی باتیں سنی ہیں۔ اپنے اصولوں پر سختی سے کاربند ہیں

عقیل : ادھر ادھر چاندنی میں میرا یہ حال ہوتا ہے کہ —— خیر چھوڑیے اس بات کو

نزہت: وائلن تو آپ خوب بجا لیتے ہیں؟

عقیل: شکریہ! آپ کو سننے کا اتفاق ہوا ہے کبھی ——— میرا خیال ہے کبھی نہیں۔ پہلی مرتبہ آیا ہوں یہاں۔

نزہت: ابھی ابھی سنی تھی۔

عقیل: وائلن بجانے کا لطف اس وقت آتا ہے جب وسیع میدان ہو، چاندنی چھٹکی ہو۔ آدمی اکیلا ہو، یا اس کے ساتھ کوئی باذوق آدمی ہو۔

نزہت: سیکھی کب تھی آپ نے؟

عقیل: کالج کے زمانے میں۔ اس وقت سے لے کر اب تک میری سب سے بڑی رفیق یہی ہے۔ آپ کو بھی شوق ہے؟

نزہت: جی ہے تو ضرور، کوئی سکھانے والا ملتا ہی نہیں۔ ویسے مجھے ستار کا زیادہ شوق ہے۔

عقیل: ستار ——— ! میں سکھا دوں گا۔

نزہت: آپ ستار بجانے میں بھی ماہر ہیں؟

عقیل: جی یہ دونوں میرے رفیق ہیں ——— وائلن اور ستار۔

نزہت: رفیقوں کے انتخاب میں آپ نے بڑے اچھے ذوق کا ثبوت دیا ہے۔

عقیل: کچھ عجیب طبیعت پائی ہے میں نے۔ تنہائی کا شدید احساس مجھے انہی رفیقوں کی طرف لے گیا ہے۔ جس طرح آپ نے تنہائی سے تنگ آکر

افسانہ نویسی شروع کر دی ہے۔

نزہت: (گھبرا کر) معاف کیجئے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

عقیل: وہ تو مجھے اکثر ہوتی رہتی ہے۔ شاید میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ

نزہت: (الفاظ کاٹتے ہوئے) جی ہاں۔ مگر میرے بارے میں یہ غلط فہمی مناسب نہیں ہے۔ اول تو میں تنہائی سے بیزار نہیں ہوں۔ دوسرے افسانہ نگاری کا بھی کوئی خاص شوق نہیں ہے۔ ایک آدھ مرتبہ لکھا تھا بس۔

عقیل: جی میں نے آپ کے تین افسانے پڑھے ہیں۔ ایک کا عنوان ہے، "اس کی یاد" دوسرے کا عنوان شاید "خلش" ہے ـــــ اور تیسرے کا عنوان بھول گیا ہوں۔ بہرحال وہ بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ آپ کے افسانوں میں تنہائی کا احساس بہت زیادہ نمایاں ہے۔ میں جھوٹ تو نہیں کہہ رہا؟

نزہت: دو تین مرتبہ حماقت کر دی تھی۔ آپ لوگوں نے مجھے افسانہ نگار ہی سمجھ لیا ہے۔

عقیل: آپ کے افسانوں نے تو مجھے تڑپا دیا ہے۔

نزہت: (اشتیاق سے) میری سہیلیوں نے بھی ان کی تعریف کی ہے حالانکہ ان میں کوئی خاص بات تو ہے نہیں!

عقیل: (آہ بھر کر) آپ نہیں جانتیں۔ آپ کی تحریروں میں تو آگ بھری ہوئی ہے آگ

نزہت: مبالغے کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔

عقیل: واقعی تاثر بیان کر رہا ہوں۔ اب آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔

نزہت: عجیب بات ہے، میری واہیات تحریروں میں آگ بھری ہوتی ہے۔ کیا کہئے اس مبالغے کے!

عقیل: میں نے عرض کیا نا، یہ میرا ذاتی تاثر ہے۔ آپ کو کیونکر بتاؤں کہ میرے دل و دماغ میں جو چنگاریاں بجھ چکی تھیں، وہ آپ کی تحریریں پڑھ کر سلگنے لگی ہیں۔

نزہت: خیر یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔

عقیل: ایک لحاظ سے تو میں آپ کی ذات سے شکایت کرنے میں حق بجانب ہوں

نزہت: میری ذات سے شکایت؟

عقیل: جی ہاں، اور مجھے اس کا حق بھی ہے۔

نزہت: میں آپ کا مطلب سمجھ نہیں سکی۔

عقیل: مطلب واضح ہے۔ میرے سینے میں چنگاریاں بجھ چکی تھیں۔ اتفاق کی بات میں نے آپ کا افسانہ پڑھ لیا۔ یہ چنگاریاں از سر نو بھڑک اٹھیں۔ اس بات کا شکوہ آپ سے ——— یعنی افسانہ نگار سے نہ کروں تو کس سے کروں؟

نزہت: ان بجھی ہوئی یا سلگتی ہوئی چنگاریوں کا تعلق آپ کی اپنی ذات سے ہے اس لیے میں ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں آپ کو مشورہ دیتی ہوں کہ آئندہ میری تحریریں نہ پڑھا کریں۔

عقیل: یہ تو ممکن نہیں ہو سکتا۔

نزہت: تو پھر شکوہ نہ کیا کیجئے۔

عقیل : یہ بھی ممکن نہیں ہے۔

نزہت : تو ممکن کیا ہے؟

عقیل : آپ اس قسم کے افسانے لکھا ہی نہ کریں۔

نزہت : افسانہ نگار اپنے تجربات بیان کیا کرتا ہے۔ یہ کیوں کر ممکن ہے — کہ وہ اپنے ذاتی تاثرات سے ہٹ کر کچھ لکھے!

عقیل : مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔

نزہت : کیوں؟

عقیل : ہمدرد ہونا کوئی بُری بات ہے کیا؟

نزہت : بُری بات تو نہیں ہے۔ مگر اس کی کوئی وجہ ہونی چاہیئے۔

عقیل : آپ پوچھنا چاہتی ہیں۔ مجھے آپ سے ہمدردی کیوں ہے؟ کیا آپ کو مجھ سے ہمدردی نہیں ہے؟

نزہت : (گھبرا کر) ہے — مگر — دیکھئے اسے شاید ہمدردی نہیں کہتے

عقیل : دو طبیعتوں کے تجربات کی ہم آہنگی قدرتاً جو احساس پیدا کر دیتی ہے اسے شاید ہمدردی ہی کہا جاتا ہے یہاں تجربات کی ہم آہنگی نے ہم دونوں کو ذہنی طور پر ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہمیں ایک دوسرے سے ہمدردی نہ ہو — آپ کچھ سوچنے لگی ہیں۔ میں نے کوئی بے جا بات تو نہیں کہہ دی؟

(نزہت خاموش ہے

آپ خاموش کیوں ہیں ---- ؟

نزہت: نہیں تو۔

عقیل: شاید کوئی بھولی بسری یاد ستانے لگی ہے۔ کاش میں اس وقت یہاں نہ ہوتا۔

نزہت: پھر کیا ہوتا ---- ؟

عقیل: ادب کا ایک شہ پارہ آپ کے دل کی گہرائیوں سے نکل کر کاغذ پر آجاتا۔

نزہت: میں اس طرح نہیں لکھا کرتی۔

عقیل: میں نے سنا ہے شاعر یا ادیب صرف اس وقت لکھتا ہے جب اس کے ذہن میں جذبات کا تلاطم برپا ہو۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ اس وقت آپ کے دل و دماغ میں ایک ہیجان برپا ہے۔ کسی میٹھی سی بھولی بسری یاد نے آپ کے رنگین تصورات کی دنیا میں ایک ہلچل پیدا کر دی ہے۔

نزہت: آپ تو شاعری کرنے لگے ہیں۔

عقیل: شاعری بھی تو حقیقت ہی کے فن کارانہ اظہار کا نام ہے۔

نزہت: باتیں بنانے میں آپ ماشاء اللہ خوب ماہر ہیں۔

عقیل: حسن ظن کا شکریہ۔ بات صرف اتنی ہے۔ کہ گو میں شاعر نہیں ہوں، تاہم میری زندگی ایسے تجربات سے گذر چکی ہے۔ جو شعر و ادب کے لیے سرمایۂ حیات بن سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے آپ مجھے خوش قسمت سمجھیں

یا بد قسمت۔ بہر حال میرے دل میں ہر لمحہ ایک کسک سی محسوس ہوتی رہتی ہے

نزہت: بد قسمت کیوں؟

عقیل: تو جیسے میں آپکے قول کیمطابق خوش قسمت ہوں۔ لیکن اس کسک کی وجہ کافی دردناک ہے

نزہت: کسک کی وجہ عام طور پر دردناک ہی ہوتی ہے

عقیل: وہ بھی کیا زمانہ تھا (آہ بھر کر) رنگین تصورات کا زمانہ۔

نزہت: (مسکرا کر) اب مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔

عقیل: اب کیوں؟

نزہت: اس ایک جملے میں آپ نے بہت کچھ کہہ دیا ہے۔

عقیل: مثلاً کیا کہہ دیا ہے میں نے؟

نزہت: کیا کہوں —— جب کسی شخص کے ہونٹوں سے اس قسم کے لفظ نکلتے ہیں تو ظاہر ہے اسے اپنا خوشگوار ماضی یاد آجاتا ہے۔

عقیل: ذرا اس شخص کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کیجئے جس کا ماضی رنگین تصورات ہی کے پرتو سے زندہ ہے۔

نزہت: کاش میں اس فقرے کا مطلب سمجھ سکتی —— مگر وہ ہے کہاں؟

عقیل: کون؟

نزہت: جس نے آپکے ماضی کو اپنے رنگین تصورات کے پرتو سے زندہ کر دیا ہے

عقیل: انہی تصورات میں ــــ شاید اب بھی آپ نہیں سمجھیں۔

نزہت: انسان کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے وہ ہو نہیں سکتا۔ مثلاً اگر آپ کی وہ آپ کو چھوڑ کر چلی نہ جاتی تو آپ ساحل پر تنہا گھوما نہ کرتے

عقیل: اسی طرح اگر آپ کے ذہن میں کوئی جنونی عشق کی یاد نہ ہوتی تو آپ ایسے حسین لمحے تنہائی کی نذر نہ کر دیتیں۔

نزہت: مجھ پر تو آپ الزام لگا رہے ہیں۔

عقیل: کیوں محترمہ! الزام کیوں! محبت کرنا، محبت کے خوشگوار تصورات میں محو رہنا کوئی جرم کب سے ہے۔ تعجب ہے آپ اسے جرم سمجھتی ہیں۔

نزہت: میں نے کیا کہا ہے۔ محبت کرنا جرم ہے؟

عقیل: آپ چھپا جو رہی ہیں۔ میں تو کسی بات کو چھپانے کے لیے تیار نہیں ہوں مثلاً مجھے ایک لڑکی سے شدید محبت تھی۔

نزہت: ہوگی!

عقیل: اس لڑکی کی محبت نے میری زندگی کو کیف و مستی کی ایک لہر بنا دیا تھا۔ میں اس کثیف دنیا کی فضاؤں سے نکل کر دور افق کی رنگین وادی میں پرواز کرنے لگا تھا۔

نزہت: میں نے سنا ہے محبت کے آغاز میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ خیر تو پھر کیا؟

عقیل: ہم دونوں خوابوں کے جزیرے میں پرواز کرنے لگے تھے! ــــ اور آپ

پھر سوچنے لگیں۔

زہت: کہتے، کہتے جائیے (مستی کی سی کیفیت میں) میں سُن رہی ہوں۔

قیل: شاید آپ سوچ رہی ہیں کہ ایک آدمی بغیر پروں کے پرواز کیوں کر کر سکتا ہے

زہت: (ٹھٹک کر) معاف کیجئے مجھے کوئی بد ذوق سمجھ رکھا ہے آپ نے: جو
اِس قسم کی واہیات باتیں سوچوں گی

قیل: بس یہی بات میں سُننا چاہتا تھا۔ آپ بھی پرواز کر چکی ہیں یا کر رہی ہیں؟

زہت: (مسکرا کر) آپ عجیب آدمی ہیں۔

قیل: آپ نے بڑی جلدی میری ذات کے متعلق رائے قائم کر لی۔ پوری بات
تو سُنئے۔ میں پھر اسی کثیف دُنیا میں آگیا۔

زہت: اور آپ کی وہ؟

قیل: وہ وہیں رہی۔ خوابوں کے جزیرے میں۔

زہت: خوابوں کے جزیرے میں؟

قیل: جی ہاں۔ اس کا مادی وجود تو تھا ہی نہیں میرا مطلب ہے، وہ صرف تخیلی تھی

زہت: پھر کیا تھی وہ؟

قیل: اس کے سارے وجود کو میں نے اپنے خوابوں کی رنگینیوں سے تعمیر کیا تھا وہ
میرے تصورات کی شہزادی تھی، مگر ایک دن ہم ایک دوسرے سے جُدا ہوگئے
اور اب میرے ذہن میں حسین یادوں کے ذرّوں سے لپٹے ہوئے چند مبہم نقوش

کے علاوہ، اور کچھ بھی نہیں ہے۔

نزہت: مجھے معلوم نہ تھا آپ اس قدر تخیل پرست ہوں گے لیکن آپ کی یہ تخیلی محبوبہ چلی کیوں گئی؟

عقیل: تخیل ہی نے اُسے بنایا تھا تخیل ہی نے ختم کر دیا۔

نزہت: آپ کا تخیل اسے دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔

عقیل: نہیں اب ایسا نہیں ہو سکتا —— اب ایسا نہیں ہو سکے گا!

نزہت: وجہ کیا ہے اس کی؟

عقیل: اگر آپ انسانیت کی ایک بنیادی حقیقت پر غور کریں تو معاملہ خود بخود صاف ہو جائے گا۔

نزہت: آپ ہی فرمائیں۔

عقیل: یہ بنیادی حقیقت انسان کی فطری ناصبوری ہے۔ میری محبوبہ میرے تصورات کی دُنیا میں سانس لیتی تھی، مگر میں چاہتا تھا اُسے خارجی دنیا میں بھی دیکھوں۔ میرے ذہن میں فطری ناصبوری اور تخیل کی کرشمہ سازی کے درمیان ایک کشمکش سی برپا ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ حسین پیکر جو سرتاپا ایک تخیل تھا۔ خوابوں کے دھندلکے میں غائب ہو گیا۔۔

نزہت: آپ اُسے خارجی دنیا میں لا سکتے تھے۔

عقیل: لانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ میرا مطلب ہے۔ میں تخیل کی کرشمہ

سازیوں سے خود بخود پریشان ہو گیا تھا۔

ہست: اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنی تخیلی محبوبہ کے جو نقوش اپنے ذہن میں محفوظ کر رکھے تھے وہ کسی خارجی پیکر میں منتقل نہ ہو سکے۔

تمل: مجھے کسی خارجی وجود اور ان نقوش میں مشابہت نظر نہ آئی — یہ میری انتہائی بدقسمتی ہے۔ ہے نا؟

ہت: مگر یہ دُنیا بہت وسیع ہے۔

تیل: بہت وسیع ہے، مگر اس شخص کی بدنصیبی کا اندازہ کیجئے۔ جو دُنیا کی ان لامحدود وسعتوں میں بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا ہے۔

ہت: سوائے اظہارِ ہمدردی کے اور کیا کر سکتی ہوں؟

تیل: اور میں بھی شکریہ ادا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا (دو تین لمحے خاموش رہنے کے بعد) ہم دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہونے کے باوجود کس قدر دُور ہیں۔ آپ نے محسوس کیا؟

بت: جی!

یل: میں سمجھتا تھا: دُنیا میں مَیں ہی صرف ایک ایسا آدمی ہوں۔ جو خود کو تنہا محسوس کر رہا ہے پر آج معلوم ہوا ایک اور ہستی بھی اس مرض کی شکار ہے

بت: میرا احساسِ تنہائی، آپ کے احساسِ تنہائی سے کچھ مختلف ہے

یل: ہو سکتا ہے — بہرحال تنہائی کا احساس تو ہے نا؟

نزہت: خاموش ہو گئے آپ؟ (دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)

عقیل: (سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے) عجب مصیبت ہے

نزہت: کیا ہوا؟

عقیل: کچھ نہیں، سر میں درد سا محسوس ہونے لگا ہے۔ کتنا بدذوق ہوں، اس خوبصورت چاندنی رات میں بھی دردِ سر کی شکایت لے بیٹھا ہوں۔

نزہت: سر میں درد ہے دیکھتی ہوں، اسپرین کی ٹکیاں کل رکھی تھیں کہیں، شاید الماری میں ہوں گی۔

(نزہت اٹھ کر الماری کھولتی ہے)

عقیل: تکلیف نہ کیجئے۔

نزہت: اوہ، یاد آیا وہ تو کل آپا جی نے کھالی تھیں۔ کم بخت حکیم بھی اُن کے ساتھ باہر چلا گیا ہے

عقیل: کوئی بات نہیں رومال باندھ لیتا ہوں

نزہت: میں باندھ دوں (نزہت آکر کوچ پر بیٹھ جاتی ہے)

عقیل: شکریہ! (نزہت اپنا رومال عقیل کے سر کے گرد باندھنے لگتی ہے)

نزہت: اس سے درد میں کیا فرق پڑے گا بھلا؟

عقیل: بہت فرق پڑ گیا ہے۔ ان انگلیوں میں کیا کرامات ہے (نزہت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے)

نزہت : انگلیوں میں کھلا کیا ہے

عقیل : کتنی پیاری انگلیاں ہیں۔ ان انگلیوں نے تو مجھ پر کیف و مستی کی کیفیت طاری کر دی ہے۔

نزہت : ہائے کیسی باتیں کرنے لگے ہیں آپ۔

عقیل : (نزہت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) ایک بات کہوں نزہت!

نزہت : (نگاہیں بدستور جھکائے ہوئے) فرمایئے مگر خدا کے لیے شاعری نہ کیجیے

عقیل : اپنی تخیلی محبوبہ کے جو نقوش میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کر رکھے تھے وہ آج ایک نہایت خوب صورت پیکر میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

نزہت : آپ تو اس وقت شاعرانہ کیفیت میں ڈوبے ہوئے ہیں

عقیل : خدا کرے یہ شاعرانہ کیفیت کبھی ختم نہ ہو۔

(دونوں مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)

نزہت : واقعی آپ کے سر میں درد کم ہو گیا ہے؟

عقیل : سچ کہتا ہوں نزہت! تم اب تک میری نگاہوں سے پوشیدہ کیوں رہیں؟

نزہت : آپ پہلی بار یہاں آئے ہیں۔

عقیل : محسوس ہوتا ہے آج وقت کے اُفق سے میری نئی زندگی طلوع ہو رہی ہے، نزہت! آؤ باہر چلیں، وسیع میدان میں۔

نزہت: وہ لوگ —؟

عقیل: ہم کسی اور طرف جائیں گے —؟

نزہت: اگر آپ کو اس بات پر اصرار ہے تو میں کیوں کر انکار کر سکتی ہوں؟

(دونوں اُٹھتے ہیں۔ عقیل میز پر سے دامن اُٹھاتا ہے۔ رحیم آتا ہے اُس کے ہاتھ میں تار ہے)

رحیم: بی بی جی! یہ تار آیا ہے

نزہت: (لفافہ کھول کر پڑھتی ہے اور اُسے صوفے پر پھینک دیتی ہے۔ عقیل سے) چلئے!

عقیل: کیا تار ہے؟ — میرا مطلب ہے کہاں سے آیا ہے؟

نزہت: ایک صاحب ہیں حشمت ڈھاکہ میں۔ اُن کا تار آیا ہے، آ رہے ہیں — بس چلئے بھی نا — وہ لوگ آ گئے ہیں۔

عقیل: (مدھم لہجے میں تاکہ رحیم نہ سُن سکے) چلو میری نزہت!

(دونوں مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور ہاتھوں میں ہاتھ دے کر دروازے سے نکل جاتے ہیں۔ منزہ آتی ہے)

منزہ: یہ نزہت کدھر گئی؟

رحیم: عقیل بابو کے ساتھ باہر گئی ہیں۔

منزہ: (کسی قدر حیرت سے) عقیل بھائی جان کے ساتھ؟

رحیم: جی۔

(منزہ کوچ پر تار دیکھتی ہے۔ اُسے اُٹھا کر پڑھتی ہے)

منزہ: یہ تار دکھا دیا تھا تم نے؟

رحیم: جی ہاں انہوں نے پڑھ لیا تھا۔

منزہ: اور پڑھ کر چلی گئی ہیں — (طنزاً) محبت کی آگ صرف ایک ہی مرتبہ بھڑکتی ہے

رحیم: جی؟

منزہ: کچھ نہیں بابا!

(منزہ طنزاً مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔ رحیم اپنا سر کھجاتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے جانے لگتا ہے)

پردہ

مثبت × منفی = صفر

کردار :

- ○ منیر
- ○ چچا
- ○ فرخندہ
- ○ کرین
- ○ جلیل
- ○ چچی
- ○ رضیہ

منظر

منیر کی کوٹھی کا ایک خاص کمرہ۔

خوبصورت اور سجا سجایا۔ فرش پر قالین اور صوفے۔ دیواروں پر اعلیٰ درجے کی تصویریں دروازوں اور کھڑکیوں پر منقش ریشمی پردے۔ آنے جانے کے لیے دو دروازے ہیں ایک مشرقی دیوار میں جو ملحقہ کمرے میں کھلتا ہے۔ دوسرا جنوبی دیوار میں جس کے آگے صحن ہے۔ اپریل کی ایک خوشگوار دوپہر۔

منیر ایک کوچ پر بیٹھا ہے وہ بائیس تئیس برس کا ایک خوش وضع اور خوش پوش نوجوان ہے۔ اس کے پاس ایک تپائی کے اوپر دکانداروں کے بھیجے ہوئے بل ایک ڈھیر کی صورت میں پڑے ہیں —— وہ ایک بل اٹھاتا ہے اور اس کی رقم پنسل سے ایک کاغذ پر لکھتا جاتا ہے اور بلوں کو دوسری طرف رکھتا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بولتا بھی جاتا ہے۔

منیر: (ایک نیا بل اٹھا کر) فینسی ٹیلرنگ ہاؤس۔ ایک اچکن کلاں۔ سلائی تیس روپے خرچ انیس روپے گیارہ آنے —— واہ بڑے میاں! ڈھاکہ میں کاہے کو اچکن پہنی ہوگی (دوسرا بل اٹھاتا ہے) اور یہ صاحبزادی کا میک اپ کا سامان ہے۔ توبہ، کتنی لمبی فہرست ہے۔ سارے جہان کے پوڈر اور لپ سٹکیں جمع

کرلی ہیں عمر نے۔ ستانوے روپے نو آنے ___ (نیا بل اٹھاتے ہوئے)
سوا تین سیر دودھ روزانہ، کل اکسٹھ روپے۔ معلوم ہوتا ہے گھر میں سو بار نہ
کم از کم دس مرتبہ چائے بنتی ہے (اپنے آپ کو مخاطب کر کے) اچھا بھائی نکھو!
چچا جان کا پیارا خاندان ہے اور مدت کے بعد بچھڑے ملے ہیں۔

(باہر سے چچی کی آواز آتی ہے "اری کریمن، ذرا دودھ لے آنا بازار سے
بچارے منیر کے سر میں درد ہے رات سے جلدی کر بیبی کھڑی ہے ابھی تک")
بچارے منیر کی چچی جان کو کتنی فکر ہے گھلی جا رہی ہیں اسی فکر میں۔

(جلیل پردہ ہٹا کر اندر جھانکتا ہے)

جلیل: حضور! میں اندر آ سکتا ہوں

منیر: (اس کی طرف دیکھے بغیر) آؤ بھئی جلیل! بڑے اچھے وقت پر آئے ہو اُکتا چکا تھا میں تو!

جلیل: (اندر آتے ہوئے) میدان صاف ہے شکر ہے۔ ان لوگوں نے تمہیں آج اکیلا چھوڑ دیا ہے۔

منیر: مجبوری ہے ___ چچا جان صاحبزادی کے ساتھ موٹر میں حسبِ معمول شاپنگ کے لیے تشریف لے گئے ہیں۔ رضیہ بھی ساتھ ہے چچی ابھی ابھی اُدھر گئی ہیں ___ آؤ بیٹھ جاؤ۔

(جلیل منیر کا ہم عمر ہے۔ دراز قد، سر کے لمبے لمبے بال جو گردن پر پھیلے

بت × ی = صفر

ہوئے ہیں، شاندار سوٹ میں ملبوس ہے)

جلیل: (منیر کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے) تو ہو کیا رہا ہے؟

منیر: اپنی سعادت مندی کا ثبوت دے رہا ہوں اور کیا ہو سکتا ہے؟

جلیل: اگر تمہاری سعادت مندی کا یہی عالم رہا تو اور کچھ ہو نہ ہو عنقریب کوٹھی کا نیلام ہو جائے گا اور تم ایک بڑے کامیاب اکاؤنٹنٹ بن جاؤ گے۔

منیر: مجھے بھی یہی کچھ محسوس ہو رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں

جلیل: بھائی قصور تمہارا اپنا ہے۔ کہتے کیوں نہیں ان سے۔ آخر کمزوری کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ یہاں تو معاملہ آخری حد سے بھی آگے نکل گیا ہے۔

منیر: (پنسل ہونٹوں پر رکھتے ہوئے) ذرا آہستہ بولو چچی ساتھ والے کمرے میں ہیں یہ رگ پہلے ہی تمہارے خلاف ہیں۔

جلیل: (جیب سے رومال نکال کر چہرہ پونچھتے ہوئے) تمہاری جگہ میں ہوتا تو اب سے دو مہینے پہلے کہہ دیتا۔ چچا جان! آپ نے بڑی تکلیف کی جو تعزیت کے لیے اتنی دور سے یہاں تشریف لائے۔ میرا رواں رواں آپ کا شکر گزار رہے گا۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کے کاموں میں بھی حرج ہو رہا ہو گا۔ سیٹیں ریزرو کرا دی ہیں میں نے۔ یہ لیجیے!

منیر: بابا یہ الفاظ میں تو کہنے سے رہا۔

جلیل: تو پھر صاحبزادے! وہی ہو گا جس کی یہ بندہ پیشین گوئی کر چکا ہے کوٹھی—

منیر: (الفاظ کاٹتے ہوئے) سوچتا ہوں کوئی ایسا طریقہ ہو کہ کچھ منہ سے نہ کہنا پڑے

جلیل: منہ سے کچھ نہ کہو ذرا بیزار بیزار بنے رہو۔ سمجھ جائیں گے۔ یہ لوگ کہ ہم سے تنگ آچکا ہے

منیر: توبہ کرو صاحب! ذرا سست دیکھتے ہیں تو ارد گرد گھیرا ڈال دیتے ہیں جیسے ان کی اپنی جان پر آبنی ہو۔ عجیب حالت ہے کچھ کہہ سکتا نہیں۔ آخر چچا ہے اور والدین کے بعد میرا یہی ایک رشتہ باقی ہے۔

جلیل: میں پوچھتا ہوں تمہارے چچا کا پیار بھتیجے کے لیے اپنے بھائی کی موت کے بعد ہی کیوں جوش میں آیا ہے پہلے یہ پیار کس غار میں چھپا بیٹھا تھا۔ میں نے کبھی ان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔

منیر: ابا جان بڑے کم آمیز آدمی تھے۔ رشتہ داروں سے ملنا جلنا انہیں زیادہ پسند نہیں تھا —— اور یہ چچا تو ڈھاکہ میں رہتے تھے۔

جلیل: کم آمیز نہیں تھے بھائی۔ وہ ان لوگوں کی فطرت کو خوب سمجھتے تھے۔ جہاں رشتہ داری کا مطلب صرف ذاتی مفاد ہو۔ وہاں خلوص کا کیونکر گزر ہو سکتا ہے تم زبان سے کچھ نہ کہو۔ اپنی مہمان نوازی ہی میں کمی کرتے جاؤ۔ ایک نہ ایک دن بوریا بستر سمیٹ کر چلے جانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ارے صاحب! یہ بھی کوئی بات ہے کہ بھائی کی تعزیت کے لیے آئے ہیں مع خاندان کے یہاں تین ماہ سے پڑے ہیں —— سب چیزوں پہ قبضہ کر چکے ہیں اور تم پر بھی قبضہ کرنے کی سوچ رکھی ہے انہوں نے —— اور ان صاحبزادی کا —— یعنی ہماری

ہونے والی بھابی کا کیا وطیرہ ہے ؟

منیر: وہی جو ان کے والدِ گرامی قدر کا ہے   سب سے زیادہ بل انہی کی طرف سے آتے ہیں — دن رات میک اپ کی فکر رہتی ہے انہیں۔

جلیل: ارے خوب یاد آیا۔ دو مبارکباد مجھے صاحب! اداکاری کی دُنیا میں داخل ہو گیا ہوں

منیر: واقعی ؟

جلیل: سچ (رومال سے چہرہ پونچھتے ہوئے) پر یار ڈائرکٹر نے ہیرو بنانے کی بجائے ہیرو کا باپ بنا دیا ہے۔ داڑھی والا باپ، بہت بڑا حادثہ ہو گیا ہے۔

منیر: چلو یہی غنیمت ہے۔ سٹ پر گئے ہو یا نہیں ابھی ؟

جلیل: شوٹنگ بھی شروع ہو چکی ہے (رومال سے چہرہ پونچھنے لگتا ہے۔ رومال نیچے گر پڑتا ہے) ارے میرا رومال۔

منیر: یہ عادت دور نہیں ہوئی ابھی۔ گرمی کہاں ہے جو تم بار بار رومال سے چہرہ پونچھتے ہو۔ خدارا اس عادت کو ترک کر دو۔ مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے اس سے

جلیل: یار! ایک بات سوجھی ہے مجھے۔ ایکٹنگ تو اب میرا پیشہ ہی ٹھہرا۔ اس سے کچھ فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے!

منیر: کیا مطلب ؟

جلیل: مطلب وطلب نہ پوچھو۔ بس یہ اطمینان کر لو کہ تمہیں اس بلائے ناگہانی سے

نجات تمہارا یہ ایڈیٹر دوست ہی دلوائے گا۔

نیر: کچھ سمجھ نہیں سکا۔ صاف صاف کہو بندۂ خدا!

لیل: سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ اب اجازت دو مجھے —— سٹوڈیو تک جانا ہوگا۔ اچھا! (اُٹھتا ہے) چیریو

(جلیل رومال سے چہرہ پونچھتا ہے اور جنوبی کمرے سے نکل جاتا ہے۔ منیر طبوں کی طرف توجہ کرتا ہے۔ چچی آتی ہے مشرقی دروازے سے۔ عمر پینتیس کے لگ بھگ ہوگی۔ سر سے پاؤں تک گدیلے کی طرح ایک جیسی۔ پست قامت چھوٹی چھوٹی آنکھیں لب و لہجہ اس قسم کا جیسے ہر وقت گھبرائی ہوئی رہتی ہے۔ خد و خال بھدّے۔ آواز موٹاپے کے برعکس کسی قدر باریک)

چی: کیا حال ہے بیٹا درد سر کا۔ ابھی چائے لاتی ہوں، کچھ افاقہ ہوگا —— اور یہاں کون تھا، جلیل ہوگا۔

نیر: جی! خوش خبری سنانے آیا تھا۔ ایڈیٹر بن گیا ہے۔

چی: (بھویں تن جاتی ہیں) ایڈیٹر ہی بنے گا اور کیا بنے گا (مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر لا کر) اچھا بیٹا! سر میں زیادہ درد تو نہیں ہے نا اب؟

نیر: کافی فرق پڑ گیا ہے چچی جان

چی: چائے تیار کر لی ہے میں نے، اکرمین لاتی ہے —— تمہارے چچا کہہ کر گئے تھے کہ وہ ایک پیٹنٹ دوا بھی لیتے آئیں گے۔ بس آ ہی رہے ہوں گے

منیر: چچا جان بڑا تکلف کر رہے ہیں۔ معمولی سا درد ہے

چچی: نا بیٹا! معمولی سا درد بھی بڑا سخت ہوتا ہے۔ مجھے بھی کبھی کبھی ہو جاتا ہے ہر چیز سے بیزار ہو جاتی ہوں۔ اوہ تمہارا چہرہ بھی اترا ہوا ہے۔ اگر لیٹ جاؤ تو میں ذرا سر دبا دوں۔

منیر: نہیں چچی جان! مہربانی آپ کی

چچی: ہائے بیٹا۔ میں تیری ماں ہی تو ہوں۔ مجھے بیٹے کی بڑی آرزو تھی۔ ہر عورت کو بیٹے کی آرزو ہوتی ہے۔ اللہ نے سچ مچ ایک ایسا بیٹا دے دیا ہے جو سگے بیٹوں سے بھی اچھا ہے۔ ایسا سلوک کر رہے ہو کہ سگا بیٹا کیا کرے گا اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔

منیر: یہ تو میری سعادت مندی کا تقاضا ہے چچی جان!

چچی: (منیر کی بلائیں لے کر) جیتے رہو بیٹا! ہزار برس جیو۔ تمہارے چچا جان بھی دن رات تمہارا کلمہ پڑھتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں نیک لڑکا ہو تو ایسا ہو اور میری فرخندہ کو تو ہر وقت تمہاری فکر رہتی ہے۔ صبح سویرے گلدانوں میں تازہ پھول لگانے کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں اُٹھتی ہے بھائی جان کا کمرہ معطر ہے ہر وقت باہر جانے سے پہلے تمہاری کتابیں بھی جھاڑتی پونچھتی رہتی ہے۔

(باہر سے ہارن کی آواز)

لو آگئے یہ لوگ! ارے، کریمن چائے لائی ہی نہیں (بلند آواز سے) اری او

کرمین! چائے کیوں نہیں لائی ابھی تک؟

مین : (باہر سے) لاتی ہوں بی بی! (کرمین چائے کی پیالی لاتی ہے اور تپائی پہ رکھ کر چلی جاتی ہے)

(دو تین لمحوں کے بعد جنوبی دروازے سے چچا، فرخندہ اور رضیہ آتے ہیں چچا دراز قد ہے چمکتی ہوئی اچکن میں ملبوس ہاتھ میں چھڑی۔ فرخندہ تیس برس کی دبلی شکل واجبی۔ میک اپ سے پوری طرح مزین۔ رضیہ سات برس کی بچی۔ تینوں کمرے میں آتے ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے ڈرائیور مختلف قسم کے لفافے اٹھائے آتا ہے)

ا : بڑی دیر لگا دی آپ نے۔

خندہ : شاپنگ جو کرنی تھی امی! بھلا دیر کہاں لگائی ہے۔ تین تو بجے تو گئے تھے (منیر سے مخاطب ہو کر) بھائی جان! ایک شاندار خوبصورت ٹائم پیس لائی ہوں، دیکھیے اے ڈرائیور! لفافے تپائی پہ رکھ دے۔ سنبھل کے سب بڑی احتیاط کے ساتھ

(ڈرائیور سب لفافے تپائی پہ رکھ دیتا ہے)

ں : کیا کچھ اٹھا کر لے آئی ہو۔ تمہیں تو بہانہ چاہیے باہر نکلنے کا۔ کیا کہیں لگے جاتی جان دل میں۔

خندہ : بھیا جان! سچ بتائیے آپ دل میں کیا کہہ رہے ہیں؟ —— بھلا دل کی بات میں کیا سمجھوں؟

یر : کچھ بھی تو نہیں۔ شاپنگ کا مطلب ہی یہ ہے کہ چیزیں خریدی جائیں اور کافی

خریدی جائیں۔

چچی: ویل تو بھائی جان کو دینے پڑتے ہیں نا۔

فرخندہ: آئندہ کبھی شاپنگ کا نام نہیں لوں گی۔ بس عہد کرلیا ہے (جیسے روٹھ جاتی ہے)

منیر: بُرا نہ مانو فرخندہ، بزرگ ایسی باتیں کیا ہی کرتے ہیں — کیا ہوا جو چچی نے یہ کہہ دیا

چچی: بھائی جان سے یہ بھی پوچھا کہ آپ کے سردرد کا کیا حال ہے؟

فرخندہ: اوہ — sorry بھجان! یہ بات تو مجھے آتے ہی پوچھنا چاہیے تھی۔

منیر: شکریہ! ہلکا سا سردرد تھا، جاتا رہا ہے۔

چچا: ارے وہ دوا کہاں گئی جو خرید کر لایا تھا! رضیہ! ذرا لانا موٹر میں سے بڑی اچھی دوا ہے۔۔ ادھر چند قطرے پانی میں ڈال کر پیو۔ ادھر شدید سے شدید سردرد غائب۔

(رضیہ بھاگ کر کمرے سے نکل جاتی ہے)

چچی: اس وقت تو چائے تیار ہے۔

چچا: ٹھیک ہے چائے بھی — بڑی اچھی پٹینٹ دوا ہے۔ بھول گئیں، ڈھاکہ میں تم بھی تو یہی دوا استعمال کیا کرتی تھیں

چچی: اچھا —! واقعی بڑی اچھی دوا ہے۔

(رضیہ بوتل لے کر آتی ہے۔ چچا چند قطرے چائے کی پیالی میں ڈال دیتا ہے)

منیر: (چائے پیتے ہوئے) چچا جان! آپ نے بڑی تکلیف کی ہے۔ کیا ضرورت

ہتی بھلا اس دوائی کی۔

چی: یہ نہ کہو بیٹا! تمہیں تکلیف ہو اور ہم لوگ آرام سے بیٹھیں۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے؟

نیر: مہربانی ہے آپ کی۔

چا: بھئی یہ مہربانی وہربانی کا لفظ نہ کہا کرو۔ مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے اس سے

چی: اور کیا۔ اولاد کے دکھ درد میں شریک ہونا والدین کا فرض ہے۔ ارے فرخو!
تو نے کہا تھا اپنے بھائی جان کے لیے آج شامی کباب بناؤں گی۔ بھول گئی کیا؟

رخندہ: بھول کیوں کر سکتی ہوں امی! (چٹکی بجا کر) ابھی لیجیے، ابھی — اے
بھجان ایک دو پل رکھ دوں ان بلوں کے بیچ؟

نیر: ضرور۔

رخندہ: ایک اور بات بھجان! — آرام آ گیا ہے نا آپ کو؟

نیر: بالکل ٹھیک ہوں

فرخندہ: تو آج سنیما چلیں گے

نیر: آپ لوگ ضرور جائیں۔ مجھے ممکن ہے باہر جانا پڑے — شاید دوست آ جائیں

فرخندہ: نہ بھجان۔ آپ کے بغیر ہم کیا فلم دیکھیں گے۔ آپ تو ہمیں ساتھ ہی ساتھ فلم
کی باریکیاں بھی سمجھاتے جاتے ہیں۔

نیر: اچھا دیکھا جائے گا۔ کافی وقت ہے سنیما جانے میں —

چی: فرخو! جاؤ اپنا کام کرو۔ فرصت ہوگی تو بھائی جان چلیں گے۔

مثبت × منفی = منفی

رضیہ : بھاجان! مجھے باجی نے موٹر لے کر نہیں دی

منیر : میں لے دوں گا۔

رضیہ : جب سینما چلیں گے اس وقت نا (تالیاں بجاتے ہوئے) بھاجان بڑے اچھے ہیں آپ!

چچی : کھانے کا وقت ہو گیا ہے بیٹی! تنگ نہ کیا کرو۔

فرخندہ : جاتی ہوں امی!

(فرخندہ کمرے سے نکل جاتی ہے اس کے ساتھ رضیہ بھی چلی جاتی ہے)

چچا : میں سوچتا ہوں ہمیں یہاں آئے ہوئے کافی وقت گزر گیا ہے۔ ڈھاکہ جانا چاہئے اب۔

چچی : کیا یہ اپنا گھر نہیں ہے؟ میرا دل تو ڈھاکہ جانے کو نہیں چاہتا۔

منیر : (آہ بھر کر) یہ بھی آپ کا اپنا گھر ہے —— ڈر صرف یہ ہے کہ آپ کا کاروبار تباہ نہ ہو جائے۔

چچی : کاروبار کونسا بڑا ہے۔ معمولی سا تو ہے۔

چچا : کاروبار کی فکر کیوں نہ ہو، تھوڑی بہت ضرور ہے۔ پر ادھر تمہاری فکر بھی لگی رہتی ہے۔ بھائی جان مرحوم بڑے تجربہ کار آدمی تھے۔ زمانے کے نشیب و فراز خوب سمجھتے تھے۔ اس لیے دوسروں کے جھانسے میں نہیں آتے تھے۔ مگر تم بڑے نیک دل بچے ہو۔ والد کا سایہ سر سے اٹھے ابھی تین ماہ گزرے

میں ڈرتا ہوں خود غرض لوگوں کے جال میں کہیں پھنس نہ جاؤ۔

چچی: ٹھیک ہی تو ہے۔ بزرگوں کا سایہ سر پر نہ ہو تو بچے غیر محفوظ رہتے ہیں۔ دُنیا میں ایمان داری تو رہی ہی نہیں۔

چچا: اور پھر منیر جیسا بچہ، یہ تو اتنا نیک دل ہے کہ ہر شخص کو اپنے جیسا بے غرض سمجھ لیتا ہے۔ اللہ اللہ ہمارے وقتوں میں لوگ کتنے اچھے تھے۔ پر اب تو وہ بات ہی باقی نہیں رہی۔

منیر: (حوصلہ کرکے) چچا جان! آپ بالکل مطمئن رہیں، میں ایسے تجربات میں سے گذر چکا ہوں کہ اب دھوکا نہیں کھا سکتا —— کوئی شخص مجھے دھوکا دے ہی نہیں سکتا مجھے آپ کے کاروبار کا بڑا خیال ہے۔

چچا: شاباش! یہ خود اعتمادی بہت اچھی چیز ہے۔ مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے ہاں بیگم! آخر کب تک ہم یہاں پڑے رہیں گے؟

چچی: (مایوسی سے) یہ بھی اپنا گھر ہے۔

منیر: یقیناً چچی جان یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔

چچی: دیکھو بیٹا! آج کل کے دوستوں سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ کبھی کسی کے جھانسے میں نہ آنا۔ سُن لیا نا؟ سب سے خبردار رہنا۔ بعض دوست بڑے مطلب پرست ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ جو ہے نا —— وہ اجڑا سا، کیا نام ہے اس کا؟

چچا: جلیل نا۔ جو بار بار رومال سے منہ پونچھتا ہے۔

چچی: جی! مجھے تو یہ کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ اللہ میرے بیٹے کو ایسے دوستوں سے محفوظ رکھے

چچا: بڑا چالاک اور شاطر ہے

منیر: نہیں چچا جان! کوئی خاص چالاک نہیں ہے اور ہو بھی تو مجھے کیا نقصان پہنچا سکتا ہے؟

(کرمین آتی ہے)

کرمین: بابو جی آپ سے کوئی ملنے آئے ہیں۔

منیر: مجھ سے ملنے آئے ہیں! بہتر۔ کہاں بٹھایا ہے؟

کرمین: ڈرائنگ روم میں

منیر: اچھا (جانے لگتا ہے)

چچی: بیٹا کہیں باہر نہ چلے جانا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بات کر کے لوٹ آنا۔

منیر: دیکھتا ہوں چچی جان (کمرے سے باہر نکل جاتا ہے)

چچی: میرا خیال ہے رضیہ کے ابا! منیر اب ہماری موجودگی کو کچھ بوجھ سمجھنے لگا ہے

چچا: ہمیں یہاں آتے ہوئے تین مہینے تو ہو چکے ہیں۔

چچی: (مسکرا کر) پر میرا دل تو یہاں سے جانے کو نہیں چاہتا۔

چچا: دل تو کسی کا بھی نہیں چاہتا۔

چچی: یہ فرخندہ کی بچی بہت فضول خرچی کر رہی ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے اور ہاں

شادی کی بات بھی طے کر لینی چاہیے۔

چچا: تم طے کر دینا اور اسے بتا دینا کہ ہمارا نقد روپیہ ڈھاکہ کے ایک بنک میں جمع ہے۔ کہیں قلاش نہ سمجھ بیٹھے۔

چچی: وہ تو میں کہہ چکی ہوں۔ دس ہزار روپیہ ہمارا بنک میں جمع ہے۔

چچا: ٹھیک ہے۔ اس رشتے پر اسے کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا؟

چچی: اعتراض کیا ہوگا —— ایک دن ہنس کر کہنے لگا: "فرخندہ کو شاپنگ سے بڑی دلچسپی ہے" —— یہ کم بخت کرتی بھی تو کمال ہے نا جب باہر جاتی ہے سو ڈیڑھ سو کی چیزیں خرید لاتی ہے ذرا دیکھوں جا کر۔ کباب تیار کرنا ہوں گے۔ یہ فرخو تو کچھ بھی نہیں کرے گی۔ تم ادھر جاؤ کہیں جلیل سے باتیں کرتا ہو۔ یہ شیطان بڑی طنزیہ باتیں کیا کرتا ہے۔ ہمارے خلاف اکساتا رہتا ہے۔

(چچی مشرقی دروازے میں سے نکل جاتی ہے چچا ایک دو لمحے وہیں کھڑا رہتا ہے کچھ سوچتا ہے اور پھر باہر جانے لگتا ہے کہ منیر آتا ہے منیر بڑا پریشان معلوم ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک بوڑھا آدمی بھی کمرے کے اندر آتا ہے۔ بوڑھے کی آنکھوں پر عینک ہے اور ہاتھ میں ایک بیگ)

منیر: چچا جان! ایک بڑی پرابلم پیدا ہو گئی ہے۔ یہ صاحب (بوڑھے کی طرف اشارہ کرتا ہے) آئے ہیں ایک بڑی پرابلم لے کر۔

چچا: (گھبرا کر) کیا ہوا بیٹا! گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ کیا بات ہوئی ہے؟ (معنی خیز

نظروں سے بوڑھے کو دیکھتا ہے)

منیر: ابّا جان کو (بوڑھے کی طرف اشارہ کر کے) ان کا قرض دینا تھا۔

چچا: (گھبرا کر) کیا؟

منیر: ابّا جان کی طرف سے ان کی ایک رقم واجب الادا ہے

چچا: یہ کون حضرت ہیں؟

بوڑھا: خاکسار گورنمنٹ کنٹریکٹر ہے، نام رشید احمد خاں ہے

چچا: تو کیا فرماتے ہیں آپ؟

بوڑھا: مجھے جو کچھ کہنا تھا برخوردار کو بتا چکا ہوں۔

منیر: بڑے میاں! یہ میرے چچا جان ہیں۔ باپ کے مرنے کے بعد اب یہی میرے بزرگ، غمگسار اور راہنما ہیں۔

بوڑھا: ایک شفیق اور غمگسار بزرگ کا مل جانا زندگی کی بہت بڑی نعمت ہے اللہ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ بڑے پاک طینت اور ہمدرد انسان تھے۔ اصول پرست اور خاموشی سے کام کرنے والے۔ ہم دونوں ہم پیشہ تھے۔ مگر کیا مجال جو ہم میں کبھی چشمک پیدا ہوئی ہو۔ برادرانہ محبت کے ساتھ ہم نے ساری زندگی بسر کی۔ جب بھی ان کی یاد آتی ہے دل تھام کر بیٹھ جاتا ہوں (آہ بھر کر) کتنے نیک انسان تھے مرحوم —— اللہ اللہ اب ایسے انسان کہاں!

چچا: تو مطلب کیا ہے؟

بوڑھا: عرض کرتا ہوں جناب! آپ جانتے ہیں بھائی جان، کاروبار میں نفع نقصان ہوتا ہی رہتا ہے اور کبھی کبھی آدمی اپنے دوستوں سے قرض لینے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ ایک بہت معمولی بات ہے خیر! اپنی موت سے پہلے مرحوم نے انگلینڈ سے سائیکلوں کے پرزے امپورٹ کیے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے انیس ہزار سات سو کی رقم مجھ سے بھی لی تھی اور مجھے ایک چیک دے دیا تھا۔ کاروبار میں یہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ میں نے بھی ان سے ایک بار کیا کئی بار قرض لیا تھا۔ ہم میں بدستور خوشگوار تعلقات قائم تھے صاحب! نہایت خوشگوار اور پائدار

چچا: تو ——

بوڑھا: بدقسمتی سے سائیکلوں کی قیمت ایک دم گر گئی —— مرحوم کو بہت نقصان ہوا نصف رقم بھی حاصل نہ کر سکے۔ اس کے بعد ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ ان کا چیک میرے پاس ہے۔ آپ جانتے ہیں بنک میں ان کی جتنی رقم موجود ہے۔ تو۔ بھائی جان! مجھے بڑا افسوس ہے کہ یہ تکلیف آپ کو دے رہا ہوں — مجھے بھی اپنا کاروبار چلانا ہے اور بیوی بچوں کا پیٹ بھرنا ہے۔ مرحوم کے صاحبزادے اللہ کے فضل سے بڑے نیک طبع اور اصول پرست نوجوان ہیں، میں اور کیا کر سکتا ہوں۔ یہ لیجئے چیک —— (بیگ کھولنے لگتا ہے پھر رک جاتا ہے)

منیر: چیک بالکل ٹھیک ہے چچا جان! تو اب کیا کیا جائے؟

چچا: مرحوم بھائی جان قرض تو لیا نہیں کرتے تھے۔

بوڑھا: میں نے عرض کیا نا —— مرحوم کا یہ ایک اصول تھا کہ جو کام کرتے تھے بڑی خاموشی کے ساتھ کرتے تھے۔ کئی مرتبہ انہوں نے مجھ سے قرض لیا اور ہزاروں مرتبہ میں نے ان سے لیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ چند دن اور زندہ رہ جاتے تو سب سے پہلے یہ رقم ادا کرتے۔ مرحوم ملٹری کے لیے چارپائیوں کا ٹھیکہ لے رہے تھے۔ یقیناً اس کام میں انہیں بہت فائدہ ہوتا۔ مگر انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے

منیر: چچا جان! ابا جان کی روح پر بوجھ نہیں رہنا چاہیے۔

چچا: عجیب بات ہے، معاملہ سمجھ میں نہیں آتا۔

بوڑھا: اس میں کیا عجیب بات ہو سکتی ہے بھائی جان۔ معاملہ بالکل صاف اور روشن ہے۔

منیر: چچا جان! بچوں پر کوئی مصیبت پڑے تو بزرگ ہی مدد کیا کرتے ہیں۔ یہ آپ کی بے حد مہربانی ہے کہ آپ مجھے اپنا بچہ سمجھتے ہیں۔

چچا: کیوں نہیں۔

منیر: کل چچی نے بتایا تھا، آپ کی کچھ رقم بنک میں جمع ہے۔

چچا: وہ تو —— معمولی سی رقم ہے بیٹا! بالکل معمولی سی

منیر: انہوں نے دس ہزار بتایا تھا۔ اس وقت یہ رقم بہت بڑی رقم ہے میں موٹر

بیچ دوں گا۔ سات آٹھ ہزار میں تو ضرور بک جائے گی۔ باقی جتنی رقم رہے گی اپنی تنخواہ میں سے بالاقساط ادا کر دوں گا۔

ڑھا: شاباش! فرض شناس بیٹا ہو تو ایسا ہو —— اور برخوردار یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تمہیں ایسا شفیق چچا ملا۔

شیر: چچا جان! میں نے جو کچھ کہا ہے، درست ہے نا۔

چچا: ہاں —— پر دیکھو بیٹا! بنک میں میری رقم پانچ چھ ہزار سے زیادہ نہیں اور بڑی مصیبت یہ ہے کہ میرا کاروبار تباہ ہو رہا ہے۔ پرسوں میرے ہم زلف کا خط آیا تھا۔ کاروبار کے متعلق اس نے بہت بری خبریں سنائی ہیں —— سوچتا ہوں جلدی وہاں جا کر کاروبار سنبھالوں۔ آج کل کسی پر اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ ہم زلف ہے پر میرے کاروبار میں دلچسپی نہ لے سکا۔

بوڑھا: بھائی جان! آپ بچے کے سر پر رہیں۔

چچا: مجھے جانا ہی چاہیے —— اس وقت جانے کا کیا مقصد جب کاروبار تباہ ہو جائے۔ عجیب مصیبت ہے —— جا کر خود سنبھالتا ہوں اور کیا کروں۔ کچھ دن اور یہاں ٹھیرنے کا ارادہ تھا پر ——

بوڑھا: مصیبت تو واقعی عجیب ہے —— (بڑے اطمینان سے جیب سے رومال نکالتا ہے اور چہرہ صاف کرتا ہے۔ مصنوعی داڑھی ٹھوڑی سے الگ ہو جاتی ہے۔ اب بوڑھے کی بجائے جلیل کا چہرہ سامنے ہے)

چچا: (ایک دم اچھل کر) ارے جلیل! ——— دھوکا، فریب، مصنوعی داڑھی لگا کر ہمیں لُوٹنے آیا تھا۔

منیرہ: (دانت پیستے ہوئے) تیرا ستیاناس کمبخت! منہ پونچھے بغیر نہ رہ سکا۔

چچا: بیٹا! فوراً پولیس کو خبر کرو۔

جلیل: (کھسیانی ہنسی ہنس کر) وہ تو ——— میں ایکٹنگ کر رہا تھا۔ کل میری شوٹنگ ہے نا۔ ہیرو کا باپ بنا ہوں، جی ——— ہی ہی ہی

چچا: تو یہ ریہرسل ہو رہی تھی ——— خیر شوٹنگ چل کر تھانے میں ہوگی۔ جلیل کے بچے تجھے دھوکا دیتے ہوئے شرم نہ آئی۔

جلیل: جی! پر آپ دھوکا کھا گئے نا ——— کمال کی ایکٹنگ اسی کو کہتے ہیں ہی ہی ہی

(جلیل بھاگ کر کمرے سے نکل جاتا ہے۔ چچی، فرخندہ اور رضیہ آتی ہیں گھبرائی ہوئی)

چچی: کیا ہوا ———؟

چچا: دھوکا ——— فریب ——— وہ شیطان جلیل مصنوعی داڑھی لگا کر بھائی جان کا قرض وصول کرنے آیا تھا ملعون پاجی۔ کہنے لگا (نقل اتارتے ہوئے) میں تو ایکٹنگ کر رہا تھا۔

چچی: ہائے خدا ——— میں تو پہلے ہی سمجھتی تھی۔ یہ بڑا پاجی ہے۔

چچا: وہ تو شکر کرو منہ پونچھنے کی عادت تھی شیطان کو۔ داڑھی الگ ہو گئی۔

ایسی حالت میں بچے کو کیسے تنہا چھوڑ جاؤں؟

(منیر لڑکھڑانے لگتا ہے۔ چچا اسے جلدی سے سنبھال لیتا ہے)

چی : ہائے میرے بچے کو کیا ہوا؟

چپا : صدمہ پہنچا ہے بیچارے کو ——— منیر بیٹا! اب میں کبھی نہیں جاؤں گا۔ تو اطمینان رکھ، تجھے میری موجودگی میں کوئی بھی دھوکا نہیں دے سکتا ——— ہم نہیں جائیں گے۔ نہیں بیٹا!

چی : کیا حالت ہو گئی ہے بچے کی۔ او فرخو! ——— دوڑ کر پانی کا گلاس لا۔ جلدی کر۔

(پردہ گرتا ہے)

اجنبی

کردار:

○ عزیز
○ مسعود
○ ایک بوڑھا

منظر

عزیز کی کوٹھی کا برآمدہ

برآمدے کے نیچے پانچ سیڑھیاں ہیں۔ سیڑھیوں کے بعد باغ ہے جو کوٹھی کے اردگرد پھیلا ہوا ہے۔ برآمدے کی چھت پر ایک نیلے رنگ کا لیمپ روشن ہے جس کی نیلاہٹ آخری سیڑھی پر پہنچ کر چاند کی مدھم روشنی میں تحلیل ہو جاتی ہے رات نصف کے قریب گزر چکی ہے۔ ہر طرف خاموشی مسلط ہے۔

برآمدے کے آخری گوشے میں عزیز اور مسعود کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ عزیز کی عمر تیئیس چوبیس برس کی ہوگی۔ سر پر اونی ٹوپی، گردن پر مفلر اور باقی جسم ایک قیمتی اونی کمبل میں لپٹا ہوا ہے۔ مسعود اس کا بے تکلف دوست ہے۔ سردی سے محفوظ رہنے کے لیے اس نے ایک اوورکوٹ پہن رکھا ہے۔

دونوں کے پاؤں کے قریب انگیٹھی میں کوئلے جل رہے ہیں۔

مسعود اونگھ رہا ہے مگر عزیز ٹکٹکی لگائے باغ کے اس حصے کو دیکھ رہا ہے جہاں سڑک پر دروازہ کھلتا ہے تاریکی کی وجہ سے سڑک نظر نہیں آتی دور کہیں کلاک کی آواز گونجی ہے

مسعود: (انگڑائی لے کر) ساڑھے بارہ بج گئے۔ آدھی رات بیت گئی، خدا کی پناہ! کتنی سردی ہے۔ آخر کب تک اس سردی میں اکڑتے رہیں گے؟

عزیز: میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم میرا ساتھ نہیں دے سکو گے۔ اب بھی گھر

میں چلے جاؤ۔ میں تنہا اس مہم کو سر کروں گا۔

مسعود: تم اسے مہم کہتے ہو۔

عزیز: مہم نہیں تو اور کیا ہے تمہیں کیا خبر جب وہ پُراسرار انسان گھاس پر دبے پاؤں اٹھاتا ہوا یہاں آئے گا تو اس وقت کیسا عجیب و غریب منظر ہوگا؟ کچھ دور پودوں کے پیچھے ایک سایہ سا حرکت کرے گا۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھے گا پھر رُک جائے گا، —— پھر آگے بڑھے گا —— سارے ماحول پر ایک عجیب، ایک ناقابلِ فہم طلسماتی کیفیت چھا جائے گی —— ہر چیز ایک پُراسرار کُہر میں ڈوب جائے گی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جائے گی —— یوں محسوس ہوگا۔ جیسے خوابوں کے سحر آلود جزیرے میں پہنچ گیا ہوں —— اور وہ اجنبی ——

مسعود: بڑے خوبصورت فقرے ہیں۔

عزیز: افسوس یہ ہے تم اس سحر انگیز لذت سے بالکل محروم ہو۔ کاش تم نے رائڈر ہگرڈ کا مطالعہ کیا ہوتا۔

مسعود: غمِ روزگار اتنی فرصت کہاں دیتا ہے۔ یہ سہولتیں تو تم لوگوں کو حاصل ہیں

عزیز: مسعود! مجھے معلوم نہ تھا، تم اس درجہ بدذوق ہو گئے، خدا کے لیے اس کیفیت کی نزاکتوں کو یوں پامال نہ کرو۔

مسعود: مگر یہ تو معلوم ہو کہ آئے گا کون؟

عزیز: کہہ تو دیا وہی پُر اسرار اجنبی

مسعود: عزیز! یقین کرو یہ محض تمہارا وہم ہے کوئی پر اسرار اجنبی یہاں نہیں آ سکتا۔ وہ پُر اسرار اجنبی تمہاری ذہنی دُنیا میں سانس لے رہا ہے۔ ایک تصوّر کبھی انسانی وجود اختیار نہیں کر سکتا۔

عزیز: میرا دل کہتا ہے وہ ضرور آئے گا۔ سجّاد غلط نہیں کہتا تھا۔

مسعود: سجّاد بھی تمہاری طرح ایک خبطی انسان ہے۔ آخر وہ تمہارا بھائی ہی تو ہے یہ خبطی انسان اپنے شیش محلوں میں بیٹھ کر نہ جانے کیسے کیسے عجیب و غریب تصوّرات کے جال بُنتے رہتے ہیں مگر ان کے روحانی خوابوں کو تلخ حقائق سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

عزیز: اس کے جواب میں صرف یہی کہوں گا کہ اس وسیع دنیا میں بعض ایسی باتیں بھی ہیں جنہیں تمہاری منطق سمجھنے سے قاصر ہے۔

مسعود: آخر یہ تمہاری اجنبی اور پُر اسرار شخصیت ہے کون؟

عزیز: بھئی بتا تو چکا ہوں، پندرہ بیس سال گزرے یہاں اس کوٹھی میں اس کا مالک رہتا تھا۔ اس شخص نے کوڑی کوڑی جمع کر کے یہ کوٹھی بنوائی تھی۔ اس کوٹھی سے اسے بے حد محبت تھی اور وہ کسی طرح بھی اس سے الگ ہونے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ اس کا کاروبار یک لخت تباہ ہو گیا اور وہ قرض کے بارِ گراں کے نیچے دب گیا۔ قرض خواہوں نے اس

کا سب کچھ چھین لیا۔ یہ کوٹھی میرے دادا جان کے حصے میں آئی۔ کوٹھی کے مالک کو یہاں سے جاتے ہوئے سخت دکھ ہوا اور سنا ہے وہ چند دن کے بعد ہی مرگیا۔ اب اصل واقعہ شروع ہوتا ہے۔

مسعود: تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص راتوں کو یہاں اپنی محبوب کوٹھی کو دیکھنے آیا کرتا ہے۔

عزیز: مجھے تو اس میں کوئی بعید از قیاس بات نظر نہیں آتی۔ آرزو کی شدت بعض اوقات انسان کو موت کی سرحد سے بھی کھینچ کر زندگی کے حدود میں واپس لے آتی ہے۔ سجاد کہتا ہے کبھی کبھی اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے اس کی نظر کھڑکی سے باہر اس باغ پر پڑی ہے تو اس نے ایک سائے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

مسعود: اور اس سے اس نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ ہو نہ ہو یہ اس بدنصیب انسان کی بھٹکی ہوئی روح ہے جسے اس کے دادا نے قرضے میں لوٹ لیا تھا

عزیز: اس نے یہ سایہ ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ دیکھا ہے۔

مسعود: میرا خیال ہے اس زمانے میں سجاد بی اے میں پڑھتا تھا اور بی۔ اے کے کورس میں شیکسپیئر کی ٹریجڈی "ہملیٹ" بھی ہے تم بھی آج کل اسی ڈرامے کا مطالعہ کر رہے ہو۔ کبھی تو تم نے کہا ہے کہ اس دنیا میں بعض ایسی باتیں بھی ہیں جنہیں تمہاری منطق سمجھنے سے قاصر ہے۔

زیز : تم جو جی چاہے سمجھو مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ پُراسرار اجنبی یہاں اپنی محبوبہ کوٹھی کے ارد گرد اکثر گھومتا رہتا ہے۔ پرسوں کا واقعہ ہے۔ میں ساتھ کے کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ یکایک مجھے خیال ہوا کہ کوئی شخص باہر دبے پاؤں چلا جا رہا ہے۔ اسی اثنا میں میری آنکھ لگ گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے ایک زرد چہرہ میری آنکھوں کے سامنے نمودار ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں "مجھے اس کوٹھی کے ذرّے ذرّے سے شدید محبت تھی —— یہاں میرے خوابوں کی دنیا آباد تھی۔ دُنیا اسے جو چاہے کہے مگر میں اسے اپنے حسین خوابوں کا تاج محل سمجھتا رہا ہوں —— کاش میں آخری سانس تک یہیں رہتا۔ اپنے تاج محل کی شدید محبت مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میں یہاں اب اس طرح زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ جس طرح تم کر رہے ہو۔ مجھے دکھ نہیں۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہتا۔ بس اتنی آرزو ہے اسے کوئی صدمہ نہ پہنچے، اس کے فرش، اس کی دیواروں اور اس کی چھت کی ایک ایک اینٹ میں میرے دل کی دھڑکنیں سموئی ہوئی ہیں۔ کیا تم میری آرزو پوری کرو گے۔ فانی انسان! ——" اور یکایک میں بیدار ہو گیا۔ کھڑکی سے باہر دیکھا، گلاب کے پودوں کے پاس ایک سایہ تیزی سے گزر رہا تھا —— یہ سب کچھ دیکھ کر میں کس طرح مانوں کہ یہ میرا وہم ہے —— یکلخت سرگوشی سے) مسعود! وہ دیکھو!!

مسعود : (دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے) کیا ہے؟

عزیز: (سرگوشی کے لہجے میں) خدا کے لیے آہستہ۔

مسعود: ہے کون، کہاں ہے؟

عزیز: خاموش رہو، وہ گلاب کے پودوں کے قریب۔

مسعود: سایہ تو ہے۔

عزیز: میں نہ کہتا تھا۔

مسعود: عجب تماشا ہے

عزیز: دبے پاؤں آ رہا ہے۔ وہ ادھر آئے گا۔ آج اس سے ضرور باتیں کروں گا۔ بلب بجھا دو۔

مسعود: اس کی کیا ضرورت ہے۔

عزیز: بجھا دو۔ وہ ادھر ہی آ رہا ہے۔ روشنی دیکھ کر واپس چلا جائے گا۔

(سٹیج پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ ایک منٹ تک تاریکی رہتی ہے اور جب دوبارہ روشنی ہوتی ہے تو ایک گھبرایا ہوا بوڑھا آدمی جس کا لباس پھٹا ہوا ہے۔ تیزی سے سیڑھیاں طے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مسعود جلدی سے اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

بوڑھا: (لرزتی ہوئی آواز میں) مجھے خدا کے لیے چھوڑ دو۔

(عزیز بھی اٹھ کر اس کے پاس آ جاتا ہے)

عزیز: (لہجے میں ملائمت) ڈرو نہیں بابا! ہم مدت سے تمہارا انتظار کر رہے تھے

وڑھا: اللہ جانتا ہے میں مجبور ہوں

عزیز: ہمیں سب کچھ معلوم ہے۔ آؤ۔

ڑھا: مجھے معاف کر دو۔

سعود: اُدھر آ کر بیٹھو تو سہی

عزیز: بابا تمہارے سینے میں جو آگ روشن ہے۔ ہم اس سے بے خبر نہیں ہیں۔ ہمیں تم سے گہری ہمدردی ہے۔

سعود: تم کہاں سے آ گئے ہو؟

ڑھا: میں — میں

زیز: موت کی سرحد سے گزرنے کے بعد بھی انسان کی وہی حالت رہتی ہے جو اس دُنیا میں تھی۔

سعود: موت کی سرحد؟ (ہنستا ہے)

زیز: مسعود! اس وقت تم حالات کی نزاکت کا اندازہ نہیں کر سکتے!

سعود: میں صرف یہی کہوں گا کہ اس وسیع دُنیا میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جنہیں تمہاری رومان زدہ طبیعت نہیں سمجھ سکتی! (بوڑھے سے) آؤ بابا! وہاں کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ تمہارے سینے میں نہیں بلکہ تمہارے پیٹ میں جو شعلے بھڑک رہے ہیں۔ ہمیں اس سے بے خبر نہیں

ڑھا: اللہ تمہارا بھلا کرے

مسعود: گھبراؤ نہیں، وہاں چل کر بیٹھ جاؤ، ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔

بوڑھا: نہ، مجھے جانے دو۔

مسعود: میں کہتا ہوں بابا! گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ چلو بیٹھ جاؤ۔ میں نے کہا نا ہمیں تم سے ہمدردی ہے اور ہم تمہاری مجبوری سے واقف ہیں

(بوڑھا لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ سیڑھیاں طے کرنے لگتا ہے)

مسعود: چلے چلو

بوڑھا: تم —— (زبان سوکھے ہونٹوں پہ پھیرتا ہے) تم مجھے ——

مسعود: بالکل نہیں۔

(بوڑھا کرسی پہ بیٹھ جاتا ہے۔ مسعود کوٹ اتار کر اس کی ٹانگوں پر پھیلا دیتا ہے اور انگیٹھی اس کے قریب لے آتا ہے۔ بوڑھا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتا ہے)

بوڑھا: سچ کہتا ہوں۔ م، م، مجبور تھا۔

مسعود: میں جانتا ہوں۔ عزیز! اپنے اس پُراسرار اجنبی کی داستان سننے کے لیے اپنے رومانی شیش محل سے نکل کر زندگی کی تلخ حقیقتوں کی دُنیا میں آجاؤ۔ تمہارا یہ پُراسرار اجنبی چوری کی غرض سے یہاں آیا تھا۔

عزیز: کیا ——؟

بوڑھا: (کانپتی ہوئی آواز میں) میں —— بیمار ہوں۔ پر ——

مسعود : (بوڑھے سے) بڑے میاں ! میں تم سے کچھ نہیں۔ اپنے اس دوست سے کہہ رہا ہوں جو غریبوں کو لوٹتے ہیں اور پھر اپنی کوٹھیوں میں نرم نرم گدیلوں پر بیٹھ کر رومانی خوابوں کے جال بُنا کرتے ہیں۔

عزیز : میں معاملے کو سمجھا نہیں۔

مسعود : بابا ! ذرا اسے معاملہ سمجھاؤ۔

بوڑھا : میں —— میرے بچے بھوکے ہیں —— رب واسطے ماف کر دو۔ تمہارے بچے جیتے رہیں !

مسعود : بڑے بابا میں کہہ چکا ہوں تمہیں پولیس کے حوالے ہرگز نہیں کیا جائے گا تم پہلے کتنی مرتبہ یہاں آئے۔

بوڑھا : سچ کہتا ہوں —— میرا ایک ہی بیٹا تھا۔ دق سے مر گیا۔ اس کے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ بچوں کی ماں اور میری بوڑھی —— کباب بیچ کر سات آٹھ آنے روز کماتا ہوں —— اپنا اور ان کا پیٹ کیسے بھروں

مسعود : تم پہلے کتنی مرتبہ یہاں آئے ہو ؟

بوڑھا : بابو جی پیٹ کی آگ سب کچھ کرا دیتی ہے —— مجھے جانے دو —— اب بھوکا مر جاؤں گا پر ادھر نہ آؤں گا۔

مسعود : اگر صرف تمہاری بات ہوتی تو اب تک فاقے کر کے مر چکے ہوتے —— مگر وہ دو عورتیں وہ بچے ——

ڈھا: بابوجی! میں جاؤں۔ اللہ ——— (ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتا ہے)

سعود: جاؤ۔

(بوڑھا کرٹ ایک طرف دیکھنے لگتا ہے۔ مسعود اس طرح اشارہ کرتا ہے جیسے کہہ رہا ہونے جاؤ۔ بوڑھا لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ سیڑھیاں طے کر کے چلا جاتا ہے)

زیز: یہ معاملہ کیا تھا ———؟

سعود: تم سمجھے نہیں۔ جان بوجھ کر نہ بنو۔ یہ شخص تمہارے خوابوں کا پُراسرار اجنبی نہیں ہے بلکہ ان لاکھوں کروڑوں انسانوں کا نمائندہ ہے جو تمہاری عالیشان کوٹھیوں کے سائے میں کپڑے اور روٹی کو ترستے رہتے ہیں اور پھر جرم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

زیز: مسعود! چلو! اندر چل کر سوئیں۔ طبیعت بڑی خراب ہو گئی ہے۔

سعود: اس لیے کہ تمہارا حسین خواب حقیقت کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا ہے

(عزیز کمبل لپیٹتے ہوئے جانے لگتا ہے۔ مسعود وہیں بیٹھا رہتا ہے)

(پردہ جلدی سے گرتا ہے)

خوابِ گُریزپا

کردار :

○ اماں
○ رانی
○ حشمت
○ سلیمی

منظر

(جس وقت پردہ اُٹھتا ہے۔ ہم اماں کو کمرے کے وسط میں ایک مونڈھے پر بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں۔ وہ کوئی کپڑا سی رہی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ سامنے دیوار میں لگے ہوئے کلاک کو بھی دیکھتی جاتی ہیں۔ ابھی تین بجنے میں کچھ سیکنڈ باقی ہیں۔ اماں ادھیڑ عمر کی عورت ہیں رنگ گندم گوں اور ڈھلتا ہوا۔ مسلسل محنت اور مشقت سے رخساروں کی ہڈیاں باہر نکل آئی ہیں اور آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں۔ لباس سفید اور صاف ستھرا ہے۔

اس وقت وہ جس کمرے میں بیٹھی ہیں وہ مختصر اور سادہ ہے۔ قریب ایک دری کے اوپر کپڑا سینے کی مشین پڑی ہے۔ دوسری طرف پلنگ بچھا ہے جس پر سفید چادر نظر آ رہی ہے اور پلنگ کے بالمقابل دو کرسیاں بھی ہیں۔ کمرے میں دو دروازے ہیں۔ ایک مشرقی دیوار میں ہے اور دالان میں کھلتا ہے اور دوسرا شمالی دیوار میں ہے جس کے آگے اماں کے اکلوتے صاحبزادے سلیم کا کمرہ ہے۔ مغربی دیوار میں ایک کھڑکی بھی ہے جس کا رخ بازار کی طرف ہے اور جس کا اس وقت ایک پٹ کھلا ہے ـــ جاڑا شروع ہو چکا ہے دھوپ میں پہلی سی تمازت باقی نہیں رہی۔

کلاک تین بجاتا ہے ـــ اماں چونک سی پڑتی ہیں۔ کلاک کی طرف دیکھتی ہیں اور کسی قدر پریشان ہو کر رانی کو آواز دیتی ہیں)

ں : رانی ! —— اے رانی !!

ی : (باہر سے) آئی اماں

ں : سلیم آگیا ؟

ی : ایک منٹ میں آتی ہوں اماں —— بس کام ختم ہو گیا ہے

ں : میں پوچھتی ہوں سلیم آگیا ہے ؟

(رانی اندر آتی ہے۔ عمر پچاس کے لگ بھگ ہو گی)

ی : جی اماں !

ں : کہاں ہے !

ن : کون اماں ! بابو جی ! وہ تو ابھی تک نہیں آئے اماں ! میں نے سارا کام ختم کر دیا ہے۔ کمرے صاف کر دیے ہیں، دری پر برش پھیر دیا ہے۔ کتابیں بھی ٹھیک ٹھاک کر دی ہیں۔

ں : کیوں نہیں آیا ابھی تک تین بج گئے ہیں۔ صبح ہلکا سا ناشتہ کیا تھا میرے بیٹے نے

ں : کل بھی بڑی دیر سے آئے تھے۔ نہ جانے کہاں صبح ہی صبح چلے گئے تھے۔

ں : کہاں گیا ہو گا۔ یہیں کسی لائبریری یا کتابوں کی دکان میں ہو گا۔ کتابیں دیکھ لے تو پھر کھانے کا بھی ہوش نہیں رہتا اسے۔

ں : اماں رات آئے تو بڑے پریشان سے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔

ں : میرا لال، اللہ کرے، سو سال جیے۔ بڑی سادہ طبیعت کا لڑکا ہے۔ دوسروں

کی طرح فیشن کا تو اسے خیال تک نہیں۔

رانی: اماں! صبح ان کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ رات دیر تک جاگتے رہے تھے شاید

اماں: پڑھتا رہا ہوگا۔ پڑھنے کا تو اسے اتنا شوق ہے کہ کسی وقت بھی کتاب ہاتھ سے نہیں چھوڑنا پسند کرتا۔ یہ شوق بچپن سے ہے۔ جب ہمسایوں کے بچے کھیل میں لگے ہوتے تھے تو میرا سلیم چپ چاپ اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھا کرتا تھا۔ باپ نے کئی بار سمجھایا بیٹا! اس طرح محنت نہ کیا کرو صحت خراب ہو جائے گی پر اس کا شوق کم نہ ہوا۔ ہر جماعت میں اوّل رہا۔ مرحوم باپ کی بڑی حسرت تھی کہ بیٹا ولایت جاکر پڑھے لیکن اس کی عمر نے وفا نہ کی۔ آج مرحوم زندہ ہوتا تو میرے بیٹے کو کمانے کی ضرورت نہ ہوتی ـــ بیچارہ اتنی سی عمر میں دفتر کا کام کر کرکے عینک کا محتاج ہو گیا ہے۔

رانی: پر اماں! میں جانوں، کئی دن سے شاید دفتر نہیں جا رہے

اماں: توبہ کرو رانی! وہ تو اتنا فرض شناس بیٹا ہے کہ بارش ہو یا آندھی دفتر سے ناغہ نہیں کرے گا۔

رانی: وہ ـــ اماں جان دفتر کے وقت گھر سے نہیں نکلتے۔ کبھی بڑی سویرے نکل جاتے ہیں اور کبھی دیر سے۔

اماں: آج کل دفتر میں بڑا کام ہوگا۔ سویرے چلا جاتا ہے (چونک کر) اری تو کیا باتیں لے بیٹھی ہے۔ کمرہ صاف کر دیا ہے؟

ں : ہاں اماں! سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر دیا ہے —— میز پر سگرٹوں کی راکھ کا ——
(دونوں ہاتھوں سے ظاہر کرتے ہوئے) اتنا بڑا ڈھیر جمع ہو گیا تھا۔ صاف کر دیا ہے

ں : سگرٹوں کی راکھ —— سلیم تو سگرٹ نہیں پیتا۔ دوست یار پیتے ہوں گے

ں : اماں! میں نے خود انہیں سگرٹ پیتے دیکھا ہے اور اماں (رازدارانہ لہجے میں)
ان کی آنکھیں —— اماں! یوں لگتا تھا جیسے —— اللہ جانے سچ ہے یا جھوٹ
—— بابو کی آنکھیں کچھ گیلی گیلی نظر آتی تھیں

ں : یہ رات دن پڑھنے کا نتیجہ ہے۔

ن : (اعتبار نہ کرتے ہوئے) اچھا اماں!

ں : زمانہ اتنا خراب ہے پر میرے سلیم کی عادتوں میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑا
اس کی طبیعت میں نیکی ہی نیکی ہے۔ کون ماں ایسے سعادت مند بیٹے پر فخر نہیں
کرے گی؟

ی : اماں یہ بات ضرور ہے۔ دوسروں کی طرح بابو نہیں ہیں۔

ں : تو نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے میرے بیٹے کا۔ یہاں آئے تجھے چند ہفتے
ہی تو ہوئے ہیں۔ میں جانتی ہوں۔ میرا سلیم کیسا ہے جب اس کا باپ مرا اس
کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ گیارہ سال کی عمر کیا ہوتی ہے، بچپن کی عمر، پر آہستہ آہستہ
اس نے گھر کی ساری ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور مجھے محسوس
ہی نہیں ہونے دیا —— کہ میں بیوہ ہو چکی ہوں —— اللہ اسے نیکی کا پھل دے ——

ہمیشہ خوش رہے۔

رانی: (کچھ سوچتے ہوئے) اماں یوں لگتا ہے جیسے آج کل کچھ پریشان ہیں۔

اماں: تجھے غلط فہمی ہوئی ہے پریشان ہوں اُس کے دشمن، وہ کیوں پریشان ہونے لگا بھلا۔ اب زیادہ باتیں نہ بنا۔ چولہے میں آگ بجھ گئی ہوگی۔ سالن کیسے گرم ہوگا

رانی: جب بابو آئیں گے سالن گرم کر دوں گی۔

اماں: انگیٹھی یہیں لے آ۔ ذرا جلدی کر شاباش!

(رانی جانے لگتی ہے اس کے ہاتھ سے ایک چھوٹی سی تصویر نیچے گر پڑتی ہے)

یہ کیا گرا دیا ہے فرش پر؟

رانی: (تصویر اٹھاتے ہوئے) تصویر ہے اماں! کسی عورت کی۔ بابو کی میز پر پڑی تھی

اماں: تو تو اٹھا کیوں لائی ہے وہاں سے؟

رانی: آپ کو دکھانے کے لیے۔ دیکھو اماں! (تصویر اماں کو دکھاتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے) کتابیں صاف کر رہی تھی، ایک کتاب میں سے گر پڑی۔ اُٹھا لی میں نے۔

اماں: بہت بے وقوف عورت ہے تو۔ تجھے اٹھانے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔

رانی: وہیں رکھ دوں جا کر

اماں: اور کیا سلیم کو تو تصویروں ویروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کسی دوست کی ہوگی۔ دوستوں سے کتابیں بھی تو مانگ کر لایا کرتا ہے۔

رانی: اماں! میں جانتی ہوں یہ کون ہے جب میں خان صاحب کے گھر میں تھی نا تو ایک

دن خان صاحب کی بیوی کے ساتھ بائی سکوپ گئی۔ وہاں یہ ناچ رہی تھی۔ اس کا نام ہے —— بڑی مشہور ہے اماں نسرین —— ڈانسر نسرین ——

اماں: کوئی ہو ہمیں اس سے کیا۔ جا کر وہیں رکھ دے اور اپنا کام کر

رانی: (تصویر کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے) اماں! دیکھو تو مسکرا رہی ہے

اماں: (ذرا درشت لہجے میں) سنا نہیں تو نے! اپنا کام کر جا کے۔

رانی: اچھا اماں! انگیٹھی یہیں لے آؤں؟

اماں: جب کوئلے سرخ ہو جائیں اس وقت لانا۔ سلیم آ ہی رہا ہوگا۔ سالن گرم رہے گا آج بڑی دیر ہو گئی ہے۔ شاید دفتر چلا گیا ہے کیا مردار دفتر ہے اتوار کو بھی کام کرنا پڑتا ہے۔

(رانی کمرے کے باہر نکل جاتی ہے۔ اماں کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگتی ہیں۔ حشمت آتی ہے۔ سن پینتیس اور چالیس کے درمیان، سفید رنگ، آنکھوں پر عینک۔ سج دھج سے متمول خاندان کی عورت معلوم ہوتی ہے —— اماں ابھی تک کھڑکی سے باہر دیکھ رہی ہیں۔ ان کی نظر حشمت پر نہیں پڑی۔ حشمت برقعے کے اوپر کا حصہ کرسی پر رکھ دیتی ہے اور کمرے کے وسط میں پہنچ جاتی ہے۔ اماں مڑ کر دیکھتی ہیں اور بڑی مسرت سے استقبال کے لیے اس کی طرف بڑھتی ہیں)

حشمت بہن، شکر ہے تم نے بھی شکل دکھائی۔ راستہ تو نہیں بھول گئیں آج کہیں۔

حشمت: آپا! آپ نے تو آنا جانا ہی چھوڑ دیا ہے ہم بھی نہ آئیں تو بات کیونکر بنے۔

ماں : یہ نگوڑ حشمت! کئی دن سے تمہارے ہاں جانے کو جی چاہ رہا تھا پر کیا کروں
گھر کے دھندوں ہی سے فرصت نہیں ملتی!

شمت : آپا بُرا نہ ماننا۔ اتنے چھوٹے سے گھر کے دھندے ہی کیا ہیں؟

ماں : تم کیا جانو! سلیم وقت کا اس قدر پابند ہے کہ اگر اسے وقت پہ کھانا نہ ملے
تو پھر اسے کھانے کی فرصت ہی نہیں ملتی — نوکرانی بے وقوف ہے۔ پگلی سی
خود ہی سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

شمت : آج سلیم نظر نہیں آ رہا۔ اتوار کو بھی دفتر بند نہیں ہوتا؟

ماں : دفتر تو بند رہتا ہے — وہ کسی لائبریری وائبریری میں ہوگا۔ تم جانو کتابوں کا
تو وہ کیڑا ہے۔

شمت : (طنزاً) جی ہاں سوائے کتابوں کے اور کچھ اسے سوجھتا ہی نہیں۔

ماں : (حشمت کا بدلا ہوا لہجہ محسوس نہیں کرتیں) ہر وقت مطالعہ! کچھ عرصہ ہوا کہہ رہا تھا
مقابلے کے امتحان میں بیٹھوں گا اماں! ارے اب تک کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھو نا۔

(حشمت کرسی پہ بیٹھ جاتی ہے)

شمت : آپا! میں آج کچھ کہنے آئی ہوں۔

ماں : ضرور کہو (مسکرا کر) اولاد کی شادی کے موقع پر والدین کو بھی کیا کیا فکریں
ستاتی ہیں — (رانی کو آواز دے کر) رانی! ذرا ادھر آئیو!

شمت : آپا! دیکھو میرے لیے کچھ نہ منگوانا۔ پیٹ میں ذرا بھی گنجائش نہیں ہے۔

ماں : چائے کی ایک آدھ پیالی سے کیا ہوتا ہے ؟

(رانی آتی ہے)

انی : جی اماں !

ماں : جلدی چائے تیار کر دو اور سالن کا کیا کیا ہے ۔ انگیٹھی میں کوئلے سُرخ نہیں ہوئے ابھی تک ؟

انی : ہو رہے ہیں اماں ! یہاں لے آتی ہوں ۔

اں : اچھا چائے تو جلدی سے تیار کر دے ۔

شمت : آپا ! آپ خواہ مخواہ تکلف کر رہی ہیں ۔ کیا ضرورت ہے چائے کی ۔

اں : جاؤ رانی ! اپنا کام کرو — ہاں تو کیا کہہ رہی تھیں تم !

شمت : کہا تو ابھی کچھ نہیں — کہنے والی ہوں — رانی تم جاؤ ۔

(رانی چلی جاتی ہے)

ال : کیا بات ہے آخر ؟

شمت : آپا ! میں سوچتی ہوں ، بہتر یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کو شکایت ہو تو دل میں نہ رکھے فوراً زبان پہ لے آئے ۔ کیونکہ ابتدا میں سب کچھ ہو سکتا ہے پر جب وقت گزر جائے تو انسان کو پچھتانا پڑتا ہے ۔ بات یہ ہے آپا کہ نگہت کے ابا جان دو تین بار اپنے برخوردار کو ایک ڈانسر کے ساتھ ہوٹل میں دیکھ چکے ہیں ۔

اں : (بڑے اطمینان سے) سلیم کو دیکھا ہے ۔

حشمت: جی ہاں، ایک مرتبہ نہیں تین مرتبہ۔ آپ جانتی ہیں یہ کوئی مناسب بات نہیں ہے نہ اس کے لیے اور نہ اس کے خاندان کے لیے

امّاں: کوئی ہوگی اس کی کلاس فیلو۔ اس سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔

حشمت: آپا! وہ اس کی کلاس فیلو کہاں ہوگی، ڈانسر ہے۔ اشتہاروں میں اس کا نام چھپتا ہے۔ آپ نے بھی یقیناً سُنا ہوگا۔ نسرین ڈانسر کا نام کس نے نہیں سُنا؟

امّاں: (اسی اطمینان سے) تو ہوا کیا۔ اس سے میرے سلیم کے اخلاق پر کیا اثر پڑا۔ کیسی عجیب باتیں کر رہی ہو۔ میں اپنے بیٹے کو خوب سمجھتی ہوں اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ جہاں تک کیریکٹر کی پاکیزگی اور ذہنی شرافت کا تعلق ہے۔ میرا سلیم ایک چٹان ہے جسے وقت کا بڑے سے بڑا طوفان بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا۔ میرے سلیم کو تم نے کیا سمجھا ہے۔ مجھ سے پوچھو حشو! میں جانتی ہوں اسے۔ میں جس نے اسے اپنی چھاتی کا دودھ پلایا ہے۔ جس نے اسے لوریاں سُنا سُنا کر سلایا ہے۔ جس طرح مجھے اس بات پر یقین ہے کہ میرا اس وقت زندہ ہونا ایک حقیقت ہے اسی طرح میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میرا لختِ جگر جس بلندی پر کھڑا ہے۔ وہاں بدی کا کوئی تصور بھی نہیں پہنچ سکتا ــــ ایک ڈانسر اس کا دل موہ لے ــــ توبہ توبہ کرو بہن۔ آندھی کے جھونکوں سے چاند کا چراغ نہیں بجھ سکتا۔

حشمت: آپ نے تو شاعری شروع کر دی ہے! کسی ماں کو بھی اپنے بیٹے پر اتنا اندھا یقین نہیں ہوگا جتنا آپ کو اپنے بیٹے پر ہے۔

ماں: یہ اندھا یقین نہیں ہے۔ میں نے اسے پرکھا ہے، اچھی طرح پرکھا ہے اور پھر یقین کیا ہے۔

شمت: آپ نہ مانیں تو اور بات ہے، بہرحال یہ حقیقت ہے کہ نکہت کے ابا اس کو دو تین مرتبہ ڈانسر کے ساتھ دیکھ چکے ہیں اور ہمیں سلیم سے کبھی اس قسم کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے شکایت کی ہے اور آپ نے بُرا مانا ہے مگر اس امر پر بھی تو غور کیجیے کہ میری بچی آپ کے لڑکے کی شریکِ حیات بننے والی ہے۔ ایسی حالت میں کیا مجھے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جو کچھ دیکھوں اور سنوں اسے آپ کے گوش گزار کر دوں! میں سمجھتی ہوں ہر ماں کو یہ حق پہنچتا ہے۔

ں: (بڑی دل جمعی سے) جو کچھ چاہتی تھیں کہہ دیا ہے تم نے یا کچھ اور بھی کہنا باقی ہے۔

شت: میں یہی لفظ آپ تک پہنچانے کے لیے آئی تھی۔

ں: تو سنو بہن! میرا سلیم دوسروں سے بہت مختلف ہے۔ وہ کبھی عام سطح پر نہیں آ سکتا۔ اس کی زندگی کا دامن بے داغ رہا ہے اور ہمیشہ بے داغ رہے گا۔ میں نے انگلی پکڑ کے جس راستے پر لگایا ہے۔ میرا لال اسی راستے پر چلتا رہے گا۔

ت: آپا! بعض اوقات ایک راستے سے کئی راستے پھوٹ نکلتے ہیں۔ ممکن ہے وہ کسی اور راستے پر جا پہنچا ہو اور آپ کو خبر تک نہ ہو۔

ں: یہ نہیں ہو سکتا —— یہ نہیں ہو گا۔

ت: نہ مانیے مرضی آپ کی —— بہرحال نکہت کے ابا نے کہا ہے کہ آئندہ ایسا

واقعہ نہ ہو۔ آپ اس سے ذرا پوچھئے تو سہی۔

(کرسی سے برقعہ اٹھاتی ہے)

اماں: یہ کیا —— برقعہ کیوں اٹھا لیا؟

حشمت: اب جانا چاہیے اور بھی کئی کام ہیں۔

اماں: چائے تو پی کر جاؤ۔ ارے رانی! چائے تیار نہیں ہوئی ابھی!

(رانی ٹرے میں چائے لے کر آتی ہے اور حشمت کے سامنے میز پر رکھ دیتی ہے۔ حشمت پیالی ہونٹوں سے لگا کر دو تین گھونٹ چپ چاپ پیتی ہے اور پھر پیالی رکھ دروازے سے نکل جاتی ہے —— اماں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ مگر خاموش رہتی ہیں)

رانی: کوئی شکایت لے کر آئی تھیں!

اماں: (رانی کو مخاطب کیے بغیر) ان لوگوں کی سمجھ پہ تو پتھر پڑ گئے ہیں نہ جانے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میرے سلیم اور دوسرے لڑکوں میں بہت فرق ہے۔ کبھی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سلیم بھی وہی حرکتیں کرنے لگے جو عام لڑکے کرتے رہتے ہیں۔ —— وہ تو ایک کنول کا پھول ہے جو کیچڑ میں بھی اپنی تر و تازگی اور خوبصورتی قائم رکھ سکتا ہے۔

رانی: وہی ڈانسر والا قصہ ہے نا اماں!

اماں: ڈانسر ہو یا کوئی اور ہو، کیا فرق پڑتا ہے۔ اس سے —— بھئی مجھے تو باتیں کرنے

کا مرقعہ خدا دے۔ انگیٹھی کہاں ہے؟

رانی : لے آتی ہوں امّاں یہاں۔ کوئلے سُرخ ہو چکے ہیں۔

(رانی جانے لگتی ہے۔ دروازے پر دستک کی آواز آتی ہے

امّاں : دیکھو کون ہے۔ پہلے انگیٹھی رکھ جاؤ۔

(رانی کمرے سے نکل جاتی ہے۔ امّاں کھڑکی کے پاس کھڑی رہتی ہے۔ رانی انگیٹھی لے کر آتی ہے۔ اس پر سالن کی پتیلی پڑی ہے۔ دروازے پر زور سے دستک)

شابش !— دیکھو جا کے کون ہے۔ میرے سلیم کا دوست ہوگا۔ بڑے ادب کے ساتھ بات کیا کرو اس کے دوستوں سے۔ سُن لیا۔

(رانی انگیٹھی فرش پر رکھ کر کمرے سے باہر نکل جاتی ہے امّاں وہیں کھڑی رہتی ہیں۔ چند لمحوں کے بعد رانی واپس آتی ہے۔ بڑی پریشان ہے۔)

نی : امّاں ——

اں : کیا ہوا؟ پریشان کیوں ہے؟

انی : امّاں —— دروازے پر پولیس ——

اں : کیا کہہ رہی ہے؟

نی : سپاہی کھڑے ہیں۔

اں : گلی میں کسی کو ڈھونڈنے آئے ہوں گے۔ پرسوں خان صاحب کے نوکر نے

چوری کی تھی نا

انی: امّاں —— وہ کہتے تھے بابو!

امّاں: بس اتنی سی بات پہ گھبرا گئی ہو۔ واہ تیرے سینے میں تو ایک چڑیا کا دل ہے
میرے سلیم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہوں گے اور کیا کہیں گے؟

رانی: پہ انہوں نے بڑے غصے سے کہا، سلیم اندر آیا ہے یا نہیں۔

امّاں: سپاہیوں کا لب و لہجہ ہی ایسا ہوتا ہے۔

رانی: میرا دل ڈول رہا ہے امّاں —— کچھ ہونے والا ہے —— کچھ ہو گیا ہے امّاں!
وہ سلیم ہی کر ——

امّاں: کتنی بدتمیز ہوتی جا رہی ہے تو —— بابو جی نہیں کہا جاتا ——

رانی: وہ دروازے کے ارد گرد کھڑے ہو گئے ہیں، جیسے، جیسے —— (رنگ زرد
پڑ گیا ہے۔ کچھ کہہ نہیں سکتی)

امّاں: پتہ نہیں تجھے کیا ہو گیا ہے بیٹھے بیٹھے

رانی: آپ جا کر دیکھئے تو امّاں!

امّاں: کیا ضرورت ہے۔ میں جانتی ہوں، تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔

(رانی انہیں حیرت کے عالم میں دیکھنے لگتی ہے۔ اماں کھڑکی کے پاس کھڑی ہیں
ان کی نگاہیں کلاک پر جمی ہیں۔ سلیم آتا ہے۔ ایک دراز قد اور صحت مند نوجوان
اس وقت اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ چہرے پر جا بجا خراش کے

نشانات ہیں۔ بائیں بازو کے قریب قمیص پھٹی ہوئی ہے اور دائیں ہاتھ سے خون بہہ رہا ہے)

نی: بابو!

ں: سلیم!

لیم: (ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے) شی۔

اں: یہ تیری کیا حالت ہے میرے لال۔ بال بکھرے ہوئے، ہاتھ زخمی — ہائے کہیں گر پڑا ہے — رانی بھاگ کر جاؤ اور ڈاکٹر کو لاؤ۔

لیم: اماں! ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس بہت کم وقت ہے صرف چند لمحے ہیں۔ باورچی خانے کی دیوار پھاند کر آیا ہوں۔ باہر دروازے پر سپاہی بیٹھے ہیں۔

(اماں اسے یوں دیکھ رہی ہیں جیسے کوئی خواب پریشان دیکھ رہی ہوں رانی سراسیمہ ہے)

ماں: تو — تو (کچھ کہہ نہیں سکتیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بیٹے کو دیکھنے لگتی ہیں)

لیم: میں اپنی زبان سے وہ حقیقت بتانے آیا ہوں جو عنقریب ایک افسانہ بن جائیگی

(اماں اسی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہی ہیں)

ماں! تو نے اپنے بیٹے کو ہمیشہ ایک معصوم بچہ سمجھا ہے جو زندگی کے باغ میں ایک پھول کی طرح کھلا ہے — تو کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ چند ماہ

سے تیرا سلیم کتنے بڑے طوفان کی لہروں میں بہا چلا جا رہا ہے۔ تو سمجھتی تھی میں یونہی پڑھتے پڑھتے سو جاؤں گا اور یہ سوچ کر تو میرے کمرے سے نکل کر بڑے اطمینان کے عالم میں اپنے بستر پر جا لیٹی تھی۔ یہ تیرا روزانہ کا معمول تھا — اور تو اپنی جگہ کتنی مطمئن تھی، کاش تو ہمیشہ مطمئن رہتی — کاش میں تیرے اس حسین خواب کو کبھی پامال نہ کرتا — ہر رات کو جب تو مستقبل کے وہ سہانے خواب دیکھتے دیکھتے سو جاتی تھی جسے ہر ماں اپنی عزیز ترین متاعِ حیات سمجھتی ہے تو میں اپنے خوابوں کی شاداب وادی میں چلا جاتا تھا۔ جہاں میں ہوتا تھا اور نسرین ہوتی تھی تو نے نسرین کا نام کبھی نہیں سنا ہوگا۔ تو ایک لمحے کے لیے بھی تصور نہیں کرتی تھی کہ تیری امیدوں کا سہارا ایک دن ایک سٹیج پر ناچنے والی عورت کے پیچھے دیوانہ ہو جائے گا — سمجھتا تھا یہ محض جذبات کا اُبال ہے جلد ہی ختم ہو جائے گا — لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ عورت میرے دل و دماغ پہ چھا گئی — یہاں تک کہ میں نے سمجھ لیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے زندگی کی تمام منزلیں طے کر لیں گے! میں تجھے سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا اور جس دن میں نے تیرے سامنے اپنے دل و دماغ کے دروازے کھول دینے کا ارادہ کیا — اُسی دن نسرین مجھ سے چھین لی گئی۔ دولت نے اسے اپنی طرف پکارا۔ وہ ایک معمولی کلرک کی محبت کا کیوں خیال کرتی — وہ دولت کی طرف چلی گئی اور کلرک اپنی آرزوؤں اور حسرتوں کی لاش اپنے کندھے پہ اٹھائے گھر واپس آ گیا — یہ صدمہ بجلی بن کر

میرے ذہن پر گرا پر میں نے سمجھ لیا موجودہ سوسائٹی میں جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا ہے وہ کوئی غیر متوقع نہیں ہے — اپنی آخری اُمید کی ٹمٹماتی ہوئی لو میں نے خود پھونک کر بجھا دی اور آوارہ گردی کرنے لگا۔ خیال تھا آہستہ آہستہ مجروح زندگی سکون حاصل کرے گی — پر وہ ظالم جس نے مجھ سے نسرین کو چھینا تھا۔ صرف اسی پر اکتفا نہ کر سکا۔ وہ میرے زخموں کو کریدنے لگا۔ مجھ پر طعن و تشنیع کے زہر آلود تیر گرانے لگا۔ وہ ہر جگہ میری شکست خوردہ محبت کا مذاق اڑاتا — ہر موقعے پر طرح طرح کے فقرے کس کر مجھے ذلیل کرنے کی کوشش کرتا۔ — آج ایک ہوٹل میں اس نے میری بے کسی کا بری طرح مذاق اُڑایا۔ میرا خون کھولنے لگا۔ میں نہیں جانتا اشتعال کی حالت میں مَیں نے کیا کیا — مجھے ہوش اس وقت آیا۔ جب میرے سامنے ہوٹل کے فرش پر اس کا خون آلود جسم پڑا تھا — سب کچھ اچانک ہو گیا — اس طرح ہو گیا کہ میں کچھ سمجھ ہی نہ سکا اور جب سمجھا تو پانی سر سے گزر چکا تھا —

سلیم زبان ہونٹوں پر پھیرتا ہے۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئی ہیں دو تین لمحے خاموشی طاری رہتی ہے۔ اماں بدستور اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہیں — رانی بُت بنی کھڑی ہے۔ سلیم ہاتھ سے آنسو خشک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب اس کی آواز میں ملائمت پیدا ہو گئی ہے

ماں! تجھے میرے بچپن کا ایک واقعہ یاد ہے نا۔ میں کسی باغ میں ایک تتلی کے

پیچھے بھاگ رہا تھا —— تو نے کہا تھا، نہ بھاگ بیٹا۔ گر پڑے گا —— راستہ بھول جائے گا۔ میں رُک گیا تھا —— ماں! آج ہی سمجھ لے کہ تیرا بیٹا ایک سنہرے سپنے کے پیچھے بھاگتا بھاگتا بہت دُور چلا گیا ہے —— ایک ایسے راستے پر چلا گیا ہے۔ جو اُفق کے اس پار تاریک سایوں کی پُر اسرار دُنیا میں گُم ہو گیا ہے —— اب تیرا بیٹا واپس نہیں آئے گا۔ بہت دُور نکل گیا ہے —— میں آخری بار آنسو بھری آنکھوں سے تیرے مقدس ہاتھ کو چومتا ہوں، الوداع امّاں —— الوداع ——

(سلیم کمرے سے نکل جاتا ہے —— رانی اسے جاتے
ہوئے دیکھتی ہے۔ پھر یک لخت امّاں کی طرف
بھاگتی ہے)

نی: امّاں —— وہ چلا گیا —— چلا گیا، بلاؤ اُسے۔ امّاں! تو بولتی نہیں۔ —— تو —— امّاں!

(امّاں پتھرائی ہوئی آنکھوں سے
اُسے دیکھتی ہے)

: امّاں! —— تجھے کیا ہو گیا ہے؟

ل: (خلا کو گھورتے ہوئے) رانی! کیا میری طرح تو نے بھی کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ کتنا بھیانک خواب، میں نے دیکھا جیسے میرا سلیم آیا ہے مجھ سے

الجھے بال، چہرے پر خراشوں کے نشان اور زخمی ہاتھ ——— وہ کہہ رہا ہے۔ امّاں! میں بہت دُور چلا گیا ہوں ——— ایک ایسے راستے پر جو اُفق کے اس پار تاریک سایوں کی پُراسرار دُنیا میں گم ہو گیا ہے ——— توبہ، جاگتے ہوئے بھی ایسا ہولناک سپنا!

نی : (دردناک لہجے میں) اماں ——— یہ سپنا نہیں ——— امّاں!

ں : تجھے کیا ہو گیا ہے ——— میں جانتی ہوں ——— مجھے یقین ہے وہ ابھی آئے گا ——— میرا سلیم، آتے ہی کہے گا، امّاں کھانا کہاں ہے۔ اری دیکھیو تو ——— کوئلے بجھ گئے ہیں، سالن گرم کیسے ہو گا۔ شاید وہ آ گیا ہے۔ قدموں کی چاپ سُن رہی ہوں، آ گیا سلیم، ادھر بلا آؤ ——— اس بھیانک خواب کا اس سے ذکر نہ کرنا۔ سُنا! اوہ ———

(پاؤں ڈگمگانے لگتے ہیں۔ رانی
بھاگ کر انہیں تھام لیتی ہے)

——— مجھے چھوڑ دو ——— خواب کا اثر ابھی تک میرے دماغ پر ہے۔ توبہ ——— کہنے لگا ——— میں دُور ——— چلا گیا ہوں ——— اُفق کے اس پار ———

(آواز آہستہ آہستہ مدھم ہو جاتی ہے)

اور وہ گر پڑتی ہے)

رانی (سسکیوں میں) اماں! ––– اماں!!

(پردہ)

یہ کتاب قابل [illegible] ہے

دیکھ کر پڑھ کر بکد کسی کو

دیتا وقت

خرد برد [illegible]